خردنامہ جلالپوری

علی عباس جلالپوری

آج سے کم وبیش بیس برس پہلے مجلّہ ادبی دُنیا میں میرا ایک مضمون " دنیائے اسلام میں خِرد افروزی کی ضرورت " کے عنوان سے شائع ہوا تھا جو میری کتاب " اقبال کا علمِ کلام " کا آخری باب ہے۔

مغربی ممالک میں اٹھارویں صدی میں ENLIGHTENMENT کی تحریک برپا ہوئی تھی۔ راقم السطور نے اس کا ترجمہ تحریک خرد افروزی سے کیا۔ خرد افروزی کی یہ تحریک ہالینڈ اور فرانس سے شروع ہوئی اور تمام مغربی ممالک میں پھیل گئی۔ اس کے ترجمانوں میں بیل، دیدرو، والٹیر، کندورسے، دولباخ، دی مابلی، کیبانے، دالمبر اور مان تسکو مشہور ہوئے۔ سائنس کے فروغ کے ساتھ اہلِ علم نے محسوس کیا کہ علومِ جدیدہ کی روشنی میں ضروری ہے کہ انسانی معاشرے کی از سرِ نو تشکیل کی جائے اور تحقیقی علوم کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے۔ اس مقصد کے لئے دیدرو اور اس کے ساتھیوں نے ایک جامع قاموس العلوم مُرتّب کی قدرتاً اہلِ کلیسا نے اس کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا لیکن اس کی اشاعت کو نہ روک سکے۔ اہلِ فکر نے محسوس کیا کہ روحانیت، باطنیت اور نام نہاد رُوحانیت و مذہبی جُنون سے ہٹ کر سائنسی علوم کی روشنی میں معاشرۂ انسانی کو مدون کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی ممالک میں عقلیت پسندی اور خرد افروزی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا اور علمِ کلام کے نام پر تقلیدِ جامد کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سائنس کے انکشافات کو ذہنی طور پر قبول

نہ کر سکے۔ دُنیائے اِسلام میں خِرد افروزی کی تحریک مامون الرشید کے زمانے میں "اعتزال" کے نام سے شروع ہوئی تھی لیکن تنگ نظر فقہار کی مخالفت کے باعث دم توڑ گئی۔ کوتاہ بیں اور تاریک دماغ فقہار نے معتزلہ کی کتابوں کو چُن چُن کر نذرِ آتش کیا اور اُن کو مذہبی جنون کا نشانہ بنایا۔ اہلِ مغرب کی دیکھا دیکھی ہمارے ہاں بھی تحریک احیا العلوم کا چرچا ہوا لیکن اسے علم کلام اور تقلید بے جا کی نذر کر دیا گیا۔ فقہا کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ عقلی علوم کو فروغ ہوا تو ان کی دین فروشی اور دکان آرائی کا پردہ چاک ہو جائے گا۔ یہ صُورتِ حال آج بھی موجود ہے۔ ہر سال اسلامی ممالک میں سیکڑوں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ ان کے موضوعات ہر اسلامی میں نقلی علوم تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کو لا مذہبیت اور الحاد کا سرچشمہ کہہ کر انہیں رد کر دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں سائنسی علوم اور جدید مکاتیب فلسفہ کی اشاعت کی اہمیت کو اُجاگر کرنے کے لئے راقم نے اپنی تصانیف میں خِرد افروزی اور روشن خیالی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ اُس کا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ یہ ہے کہ جب تک عقلیت پسندی کو تحکمات کی گرفت سے آزاد نہیں کیا جاتا، دُنیائے اسلام میں سائنس کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ خِرد افروزی کی اشاعت ہی سائنسی علوم کی ترقی کا باعث ہو سکتی ہے۔ خِرد افروزی کے ترکیبی عناصر درج ذیل ہیں

(۱)۔۔۔ عقلیّت پسندی کی ترویج۔

(۲)۔۔۔ سائنس اور فلسفے کو مذہبی تحکّم سے نجات دلانے کی کوشش۔

(۳)۔۔۔ انقلابیت، عقلیت پسندی یا سائنسی علوم کی روشنی میں معاشرے کو از سرِ نو مُرتّب کرنے کی کوشش۔

(۴)۔۔۔ مذہبی منافرت اور جنُون کا انسداد۔

(۵)۔۔۔ انسان دوستی کا فروغ۔

ہمارے ہاں اِحیا العلوم کے نام پر باطنیّت، تصوّف اور نام نہاد رُوحانیت کو ہر کہیں بڑھا

چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے اور اِحیا کے نام پر عوام کا ذہن گدلا کیا جا رہا ہے۔ اِحیا کا معنی ہے مُردے کو زندہ کرنا۔ جب ہمارے اصحابِ فکر مذہب کے اِحیا کی بات کرتے ہیں تو گویا وہ یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ مذہب مر چکا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ریاست کا SECULAR ہونا اشد ضروری ہے۔

راقم نے BAYLE کی طرح علمی و تحقیقی نُقطۂ نظر سے اس لُغات کی تدوین کی ہے اس کتاب کا ایک مقصد یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کے ذہن و دماغ کو روشن کیا جائے اور انہیں تنگ دلی اور تنگ نظری سے نجات دِلا کر ایسے معلومات بہم پہنچائیں جائیں جن سے قاری کی نگاہ میں وُسعت اور ذہن و قلب میں کُشادگی پیدا ہو اور وہ انفرادی اور اجتماعی مسائل کا جدید سائنس اور جدید فلسفے کی روشنی میں سامنا کر سکیں۔

یکم جولائی ۱۹۸۹ء
جہلم

علی عباس جلالپوری

ا

الف

یُونانی زبان کا الفا۔ ا بیل (کے سینگ) کی علامت تھی جو فنیقیوں نے حروفِ تہجّی مُرتّب کرتے وقت مصری ہیروغلیفی سے اخذ کی تھی۔ بعد میں یہی حروف تہجّی صورتیں بدل بدل کر ایشیا اور یورپ کی بڑی بڑی زبانوں عبرانی، ارامی، حبشی، عربی، یونانی، لاطینی اور سنسکرت میں رواج پا گئے۔ اہلِ مصر دیوتا اوزیرس کے مُقدّس سانڈ ایپس کی پُوجا کرتے تھے جسے یونانی سیراپس کہتے تھے۔ ممفس کے شہر میں اُس کا مشہور معبد تھا۔ یہی تقدّس اُس کی علامت ا کے ساتھ بھی وابستہ ہو گیا۔ باطنّیہ کے ایک فرقے حُروفی نے ا کو وجودِ مطلق کی علامت قرار دیا کیوں کہ اُن کے خیال میں جس طرح کائنات کا صُدُور بتدریج وجودِ مطلق سے ہوا ہے اِسی طرح ا سے دوسرے حروفِ تہجّی ب، پ وغیرہ نکلے ہیں۔ حُروفی الفبا کے حرُوف کو کائنات کے مختلف مظاہر کے رموز مانتے تھے۔ اس فرقے کے پیشوا فضل اللہ کو تیمور لنگ نے زندقہ کے الزام میں قتل کرا دیا تھا۔ صُوفیہ وجودّیہ نے ا کو ذاتِ مطلق اور محبوبِ ازلی کی علامت بنا دیا۔ پنجابی کے صُوفی شعرا کہتے ہیں کہ ہمیں صرف ایک وجودِ مُطلق سے غرض ہے، کثرت غیر حقیقی ہے اور بے معنی ہے۔ ا کے علاوہ ب، ت، وغیرہ جتنے حُروف ہیں وہ کثرت و تعدّد کو ظاہر کرتے ہیں جو صُوفیہ کے یہاں محض نظر کا فریب ہے۔ بلّھے شاہ ؎

مُلّاں مینوں سبق پڑھایا — الفوں اگّے کجھ نہ آیا
اُوہ ب ای ب پکاردا ائی — مُلّاں مینوں ماردا ائی

خواجہ غلام فرید ؎

ہکو الف میّنوں برما نوم ڑی   تتی ب ت مُول نہ بھانوم ڑی

الف شاہی ملنگ اپنی پیشانی پر الف کا نشان بناتے ہیں اور گلے میں بغیر آستین کی الفی پہنتے ہیں۔ فارسی کے ایک شاعر ازرقی نے امیر طغان شاہ والیٔ نیشاپور کی قوّتِ رجولیت کو بحال کرنے کے لئے مثنوی الفیّہ شلفیّہ لکھی تھی جس میں ولنگ کی علامت بن گیا ہے۔ عربی زبان میں سرو قد لڑکی کو الفیّہ کہا جاتا ہے۔

آبِ حیات

آبِ حیات ، آبِ حیواں ، چشمۂ حیواں کی دیو مالائی روایت بابل سے یادگار ہے۔ سنسکرت میں آبِ حیات کو اُمرت اور یونانی زبان میں امبروسیا کہتے ہیں۔ دونوں الفاظ کا معنیٰ ہے "غیر فانی"۔ اِنسان قدیم زمانے سے موت اور فنا پر قابو پانے کے خواب دیکھتا رہا ہے۔ آبِ حیات یا اُمرت انہی خوابوں اور حسرتوں میں سے ایک ہے۔

اَبرِ نیساں

یہ بادل بہار کے موسم میں برستا ہے۔ کہتے ہیں کہ اِس کے قطرے سیپیوں میں جن کے مُنہ اِس موسم میں کُھل جاتے ہیں، گرتے ہیں اور موتی بن جاتے ہیں لیکن اِس روایت کی حقیقت شاعرانہ تلمیح سے زیادہ نہیں ہے۔

اِبلیس

یُونانی زبان کے لفظ DIABOLOS سے نکلا ہے۔ انگریزی کا لفظ DEVIL اور فرانسیسی زبان کا DIABLE اس ترکیب کے پہلے حصّے سے اور ابلیس دوسرے حصّے سے ماخوذ ہے۔

اَبا سین

اٹک کے اوپر دریائے سندھ کو اَبا سین کہتے ہیں یعنی دریاؤں کا باپ۔ اِسے مہران اور نیلاب کے نام بھی دیئے گئے ہیں۔ اِس کی پُوجا اَندرولال کے نام پر کی جاتی تھی۔ آج بھی سندھی اِسے ولی مانتے ہیں اور اِسے دریا شاہ کہتے ہیں۔

اَبیقوریّت

اَبیقورس کا فلسفۂ لذّتیت: وہ کہتا ہے کہ لذّت کا حصول ہی خیر ہے اور یہی انسان کا مقصدِ حیات ہونا چاہیئے لیکن وہ لذّات میں فرق کرتا ہے۔ اُس کے خیال میں نفسانی لذّات گُریز پا ہوتی ہیں۔ اِن میں مداومت کرنے سے اِنسان اُکتاہٹ اور بے زاری کا شکار ہوجاتا ہے اس لئے دانشمند ذوقی و فکری لذّات کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں جو ہمیں فنُونِ لطیفہ اور تدبّر و تفکّر سے میسّر آتی ہیں۔ یہ لذّات دیر پا ہوتی ہیں اور سادہ زندگی گذارنے سے مُیسّر آتی ہیں۔ ابیقورس کہتا ہے کہ مستقبل غیر یقینی ہے کیا معلوم آئے یا نہ آئے اِس لئے حال کو با مسرّت طریقے سے گذارنا ہی قرینِ دانش ہے۔ ابیقورس دیماقریطس کی مادیّت پسندی سے متاثّر ہوا تھا۔ اُس کے خیال میں ایٹموں کی حرکت جن سے اِس دنیا کی اشیاء بنی ہیں آزادانہ ہے لہٰذا اِنسان بھی فاعلِ مختار ہے اور حصولِ مسرّت پر قادر ہے۔ اِنسان کی رُوح بھی دوسری اشیا کی طرح اپنی ماہیت میں مادی ہے اور موت کے ساتھ فنا ہو جاتی ہے چنانچہ وہ حیات بعد ممات کا منکر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے جسمانی اذیت اور درد سے پہلو بچانا مناسب ہو گا۔ اُس کی تعلیم کا حاصل یہ ہے کہ مسرّت ذہنی سکون ہی کا دوسرا نام ہے۔

ابیقورس کے مخالفین نے اُس سے انصاف نہیں کیا جب اُنہوں نے کہا کہ وہ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست کی تعلیم دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے جسمانی لذّات پر ذہنی و ذوقی آسودگی اور مسرّت کو ترجیح دی ہے۔ زندگی کے اواخر میں ابیقورس گُوناگُوں امراض میں مُبتلا ہو گیا لیکن کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا۔ اُس نے سو کے قریب رسائل لکھے تھے جو دستبُردِ زمانہ کا شکار ہو گئے۔ ابیقورس مذہب کا مخالف تھا اور کہتا تھا کہ مذہب دہشت کی تخلیق ہے۔ اِنسان قدیم زمانے سے موت اور فنا سے خائف رہا ہے۔ اِس دہشت سے نجات پانے کے لئے اُس نے رُوح کی بقا اور حیات بعد موت کے تصوّرات کا سہارا لیا۔ اُس کے خیال میں موت سے ڈرنا شیوۂ خردمندی نہیں ہے کیوں کہ اُس کے الفاظ میں "جب تم ہو گے موت نہیں ہو گی، جب موت ہو گی تم نہیں ہو گے" اپنی موت کے دن اُس نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا۔

"میری موت کا یہ دن میری زندگی کا ایک بامسرت دن ہے۔ میرے معدے اور مثانے کے امراض شدت اختیار کر گئے ہیں اس کے باوجود میری تم سے جو باتیں ہوا کرتی تھیں اُن کی یاد میرے لئے خوشی کا باعث ہے۔ مجھے توقع ہے کہ تم جو میرے لڑکپن کے دوست ہو اور چھوٹی عمر سے فلسفے کے شیدائی رہے ہو مٹرو ڈورس کے بچوں کا خیال رکھو گے۔"

مٹرو ڈورس اُس کا ایک عزیز شاگرد تھا جو دو ننھے بچے چھوڑ کر مر گیا تھا۔ ابیقورس نے اُن کی پرورش کی تھی۔ ابیقورس کے پیروؤں میں لاطینی شاعر لکریشیس قابلِ ذکر ہے۔ اُس نے اپنی مشہور طویل نظم میں مذہب کو انسان کے جملہ آلام و مصائب کا ذمّے دار ٹھہرایا ہے اور کہا ہے کہ مذہب کے نام پر انسان بے دریغ ایک دوسرے کا خون بہاتا رہا ہے اور مذہبی جنون نے مدینۂ انسانی میں صدیوں سے نفرت کا زہر گھول رکھا ہے۔

ابنِ رُشدیّت

از منۂ وسطیٰ میں اندلس کے فلسفی ابنِ رُشد کے افکار مغربی ممالک میں عام طور سے شائع ہو گئے تھے۔ اُس کے مسلکِ فکر کو ابنِ رُشدیّت اور اُس کے پیروؤں کو ابنِ رُشدی کہتے تھے۔ ابنِ رُشد کے اِس نظریے نے خاص طور سے اہلِ مغرب کو متاثر کیا تھا کہ صداقت دوگونہ ہے: فلسفے کی صداقت اور مذہب کی صداقت۔ ابن رُشدی صدیوں تک پیرس اور اطالیہ کی دانش گاہوں میں اِس بات کا درس دیتے رہے کہ مذہب اور فلسفے کے حقائق یکساں طور پر اہم ہیں۔ نتیجتہً فلسفے کو مذہب کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی۔ فرانسس بیکن نے قطعی طور پر فلسفے کو مذہب سے جُدا کر دیا اور فلسفے کا مطالعہ بحیثیّت ایک مُستقل شعبۂ علم کے ہونے لگا جس سے اہلِ مغرب آزادیٔ فکر و نظر سے رُوشناس ہوئے اور سائنس کی ترقی کے لئے زمین ہموار ہو گئی۔ دُنیائے اِسلام میں مُلاؤں نے صداقت کے اِس دوگونہ نظریّے کو رد کر دیا تھا اِس لئے ابنِ رُشد کے خیالات مشرق میں نفوذ نہ کر سکے نہ اہلِ مشرق جدید فلسفے اور جدید سائنس کے برکات سے آشنا ہو سکے۔

اپیسرا

دیوتا اندر کے بہشت کی حسین وجمیل پریاں ___ اوسناکی پریکا ___ جو سمندر کے بلونے سے نکلی تھیں۔ اِن کے دو طائفے ہیں دیولیکا (آسمانی) اور لوکیکا (دُنیوی)۔ دیولیکا تعداد میں دس ہیں اور لوکیکا کی تعداد چونتیس ہے۔ اپسرائیں اندر کو رجھانے کے لئے گندھروں (آسمانی گویے) کے سازوں کی گت پر ترغیب آور اور ہوس پرور انداز میں بھاؤ بتا بتا کر کولہے مٹکا مٹکا کر چشم و ابرو سے ذومعنی اشارے کرتی ہوئی ناچتی ہیں۔ ہندو دیومالا کے قصوں میں رمبھا، منیکا، پرم لوچا، اروسی، گھرتا چی وغیرہ اپسراؤں کا ذکر آیا ہے۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا کہ کسی رشی کے تپ جپ سے دیوتا اندر کا سنگھاسن ڈولنے لگتا تو اندر اُس رشی کو بہکانے کے لئے کوئی اپسرا اُس کے پاس بھیج دیتا تھا چنانچہ اِسی مقصد کے لئے منیکا کو رشی وشوامتر کے پاس بھیجا گیا تھا رشی اُس پر فریفتہ ہوگیا۔ کالی داس کے ناٹک شکنتلا کی ہیروئین انہی کی بیٹی تھی۔ اِس کے پیدا ہوتے ہی منیکا واپس اندر لوک چلی گئی تو پرندوں نے چوگا دے کر ننھی کو پالا جس سے اُس کا نام شکنتلا پڑ گیا کہ سنسکرت میں شکنت پرندے کو کہتے ہیں۔ بعد میں رشی کنو نے اُس کی پرورش کی جوان ہوئی تو راجہ دشینت نے اُس سے گندھرو بیاہ کر لیا۔ اُس کے بطن سے بھرت پیدا ہوا جس کے نام پر ہندوستان کا نام بھارت رکھا گیا۔

اُپنشد

اُپنشد کا معنی ہے قریب بیٹھنا یا خفیہ تعلیم دینا۔ قدیم زمانے کے گورو اپنے خاص خاص چیلوں کو اپنے قریب بٹھا کر انہیں خفیہ تعلیم دیا کرتے تھے۔ اُپنشدوں کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ ہے۔ ان میں شوتیا شوتیر، برہا دار نیاکا، کنٹھ اور چھاندوگیہ مشہور ہیں۔ ان میں برہمن (آفاقی رُوح) اور آتما (انفرادی رُوح) کی ایکتا کی تعلیم دی گئی ہے یعنی دونوں اصلاً ایک ہی ہیں۔ تت ایکم (وہ ایک) حقیقی ہے، باقی جو کثرت دکھائی دیتی ہے وہ مایا ہے، نظر کا فریب ہے۔ جب کسی آدمی پر اِس حقیقت کا انکشاف ہو جائے کہ تتوم اسی (تو وہ ہے) تو اُسے عرفان حاصل ہو جاتا ہے اور اُسے سنسار چکر سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ شنکر نے اُپنشدوں کے پریشان مباحث کو ایک محکم

منطقی نظام کی صورت میں مرتب کیا جو ویدانت کے نام سے مشہور ہوا۔ شہزادہ داراشکوہ نے پچاس کے قریب اُپنشد سِرِّاکبر کے نام سے فارسی میں ترجمہ کروائے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ قرآن میں جس کتاب مکنون کا ذکر آیا ہے اُس سے یہی اُپنشد مراد ہیں۔ داراشکوہ کے علاوہ البیرونی، شاہ غوث گوالیاری، شاہ عنایت قادری، مظہر جانجاناں اور مُلّا محسن فانی صاحب دبستان المذاہب نے اُپنشدوں اور صوفیہ وجودیہ کی وحدت الوجود میں مشترک عناصر کا ذکر کیا ہے۔

اَتاتُرک

ترکی زبان میں اَتا باپ کو کہتے ہیں۔ اتاتُرک یعنی تُرکوں کا باپ مصطفیٰ کمال پاشا کو کہا جاتا ہے جس نے یونانیوں کو شکست دے کر ترکیہ کو تباہی سے بچایا تھا اور دوُررس معاشرتی، قانونی، علمی اور لسانی اصلاحات نافذ کر کے تُرکوں کو ایک نئی قوم کی صورت میں منظم کیا تھا۔

آتن

فرعون امن ہوتپ چہارم — بعد میں اِس نے اپنا نام اِخناتن رکھ لیا — ۱۳۸۰ ق م میں مصر کے تخت پر بیٹھا۔ اُس نے خداوند خدا آمن کی پوجا کو منسوخ کر کے اُس کے پروہتوں کو کارنک کے بڑے معبد سے نکال دیا۔ کارنک میں سیکڑوں دیوداسیاں رہتی تھیں جو دیوتا آمن کی زوجیت میں دی جاتی تھیں لیکن فی الواقع پروہتوں کی ہوسناکی کی تسکین کرتی تھیں۔ اِخناتن نے معبدوں میں جانوروں کی قربانیاں دینے سے منع کر دیا اور بُت تراشی و بُت پرستی کو ممنوع قرار دیا۔ اُس نے پروہتوں کی عیاری اور ریاکاری کا پردہ چاک کیا جو تعویذ گنڈوں اور جادو کے ٹونوں ٹوٹکوں کے کاروبار سے عوام کو لوٹ رہے تھے۔ اُس نے مندروں سے وقف کی ہوئی لاکھوں ایکڑ اراضی کو ضبط کر لیا جس سے پروہتوں کا ٹھاٹ باٹ ختم ہو گیا۔ اُس نے کہا کہ معبدوں کی رسومِ عبادت پروہتوں نے ذاتی منفعت کے لیے وضع کر رکھی ہیں۔ اُس نے کہا کہ خدا ایک ہے اور وہ آتن ہے جس کی علامت سورج ہے۔ آتن خالق ہے، پروردگار ہے، رحیم ہے کریم ہے۔ اِخناتن نے تاریخِ عالم میں پہلی بار واحدانیت کا تصور پیش کیا اور مذہب کو بُت پرستی اور رسومِ عبادت

سے پاک کر دیا۔ بنی اسرائیل سے سات سو برس پہلے اُس نے کہا کہ خداوند آتن تمام اقوامِ عالم کا خدا ہے، سب انسانوں پر مہربان ہے۔ اُس کی جھلک پیڑوں اور پھولوں میں دکھائی دیتی ہے اور زندگی کی تپش اور ہر قسم کی نشوونما اُسی کے دم سے ہے، اُسی کے اثر سے "ننھے میمنے اُچھلتے کودتے ہیں اور پرندے سرکنڈوں میں پَر پھڑ پھڑاتے ہیں۔" اِخناتن نے آتن کے مجسمے تراشنے سے منع کر دیا اور کہا کہ سچے خدا کی کوئی خاص شکل و صُورت نہیں ہوتی۔ اخناتن کی اپنی زندگی مثالی تھی۔ اُس کی ایک ہی زوجہ تھی۔ ملکہ نوفرے تیت جس سے وہ دِلی محبت کرتا تھا اور اپنی سات بیٹیوں کا مہربان باپ تھا۔ اُس نے آتن کے نام سے ایک شہر بھی بسایا لیکن اُس کی موت کے بعد پروہت دوبارہ حاوی ہو گئے اور اِخناتن کا نیا مذہب منسوخ کر دیا گیا۔

اٹک

اٹکا سے ہے یعنی رُک گیا۔ آریا وادی گنگ و جمن میں جا کر آباد ہو گئے تو اُنہوں نے دریائے سندھ کو عبور کرنے پر قدغن لگا دی جس سے اس کا نام اٹک پڑ گیا۔ برہمنوں نے کہا کہ جو کوئی اِس دریا کو عبور کرے گا سیدھا دوزخ میں جائے گا۔

احدیّت

کائنات کی اصل ایک ہے، کثرت محض اعتباری ہے۔ سپینوزا، فلاطینوس، شنکر اور برگساں کے نظریات احدیّت کی مختلف صُورتیں ہیں۔ احدیّت میں دُوئی یا کثرت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ احدیّت سامی مذاہب: مُوسویّت، عیسائیت اور اِسلام کے اِلٰہیاتی تصوّر کے منافی ہے کیوں کہ اِن مذاہب میں خدا اور مادے یا خالق اور مخلوق کی دُوئی بُنیادی حیثیّت رکھتی ہے۔

اِحرام

اِحرام کا معنیٰ ہے حرام کر لینا یعنی بعض جائز باتوں کو مقرّرہ جگہوں سے حج کے تمام ہونے تک اپنے آپ پر حرام کر لینا۔ اِحرام باندھنا: بغیر سِلی ہوئی چادریں اوڑھ لینا۔ اِسلام سے پہلے عورتیں مرد برہنگی کی حالت میں سیٹیاں بجاتے ہوئے کعبہ کے سات چکّر لگایا کرتے تھے۔ بنو ہاشم نے اِحرام باندھنے کا طریقہ رائج کیا۔

اِحیاء العلوم

عُلوم کو زندہ کرنا۔ اِسے نشأۃ الثانیہ (نیا جنم) بھی کہا جاتا ہے۔ اِس تحریک کا آغاز چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں اطالیہ کے شہروں میں یُونانی عُلوم کی تدریس سے ہوا۔ تُرکوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تو وہاں کے کچھ پڑھے لکھے لوگ ارسطو، دیماستھینیز، یوری پیڈیز وغیرہ کے مسودات لے کر فلورنس چلے گئے اور یہ شہر کلاسیکی علوم کی تدریس کا مرکز بن گیا۔ یہاں کا مشہور دیمچی خاندان اساتذہ کی سرپرستی کرنے لگا۔ کوسیمو دیمچی نے فلورنس میں اکادیمی افلاطون قائم کی جس میں افلاطون کا فلسفہ پڑھانے لگے۔ لوگ تحصیلِ عُلوم کے شوق میں دور دراز کے ممالک سے سفر کر کے فلورنس، پیڈوا اور روم کی درس گاہوں میں ہجوم کر آئے۔ اطالیہ میں یہ تحریک زیادہ تر فلسفہ، ادبیات اور فُنونِ لطیفہ تک محدود رہی۔ پٹرارک اِس تحریک کا سب سے بڑا عَلَم بردار تھا۔ شمالی اور مغربی یورپ کے شہروں میں اِس کے سائنسی پہلو کو فروغ ہوا۔ کوپرنیکس، گلیلیو، نیوٹن اور کیپلر نے ہیئت اور طبیعیات میں اِنکشافات کئے اور فرانسس بیکن، دے کارت اور ہابس نے نئے فلسفے کی بنیاد رکھی، تحقیقی عُلوم کو چھاپہ خانے نے فروغ بخشا۔ اہلِ فکر کا ذہن کلیسائے رُوم کی صدیوں سے عائد کی ہوئی پابندیوں سے آزاد ہو گیا اور مذہبی توہمات و تعصبات کی تاریکیاں چھٹ گئیں۔ بیکن نے ارسطو کی منطق قیاسی پر پُرمغز نقد لکھا اور ثابت کیا کہ یہ منطق تحقیق علمی کے راستے میں صدیوں سے حائل رہی ہے۔ دُنیائے ادب میں ایراسمس، مُور، مونتین اور شیکسپیئر جیسے عقلا نے نئے نئے اسالیب وضع کئے۔ میکائیل آنجلو، رافیل، طلیان، داونچی وغیرہ نے مصوّری کے شاہ کار پیش کئے۔ سٹریڈی ویریس نے نئی موسیقی کی بُنیاد رکھی۔ اِس تحریک کے بارے میں مورّخ ڈین لون لکھتا ہے۔

"لوگوں کو ایک بار پھر محسوس ہوا کہ زندگی بڑی نعمت ہے اور محض زندہ رہنا ہی بہت بڑی مسرّت کا باعث ہے۔ یہ نتیجہ تھا یُونانی فلسفے کے اِحیاء کا جس نے ذہنوں پر صدیوں سے جمی ہوئی رہبانیت کی پھپھوندی کو دُور کر دیا۔"

آزادیٔ فکر و نظر کے ولولے سے سرشار ہو کر کولمبس، میگی لان اور واسکوڈا گاما نے دُور دراز کے

پُرخطر بحری سفر کئے۔ یہی وَلولۂ حیات اور یہی جوششِ زندگی نشاۃُ الثانیہ کی رُوح ہے۔ اربابِ نظر حُجروں اور خانقاہوں میں زاویہ نشین ہو کر طلبِ نجات کرنے کے بجائے اپنے گردوپیش کی زندگی سے دلچسپی لینے لگے اور اِس کے مسائل اور عُقدوں کو حقیقت پسندانہ انداز میں سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کا آغاز ہوا۔ وہ نگاہیں جو ایک ہزار برس سے فلاح و بہبود کی جستجو میں آسمان کی طرف لگ رہی تھیں پھر زمین کی طرف لوٹ آئیں اور اِسی زمین پر فردوسِ گُم گشتہ کی تلاش شروع ہو گئی۔

اِختلالِ ذہن

تحلیلِ نفسی کی رُو سے آدمی اُس وقت خللِ ذہن میں مبتلا ہوتا ہے جب اُس کی شعوری رَو کے تسلسل میں فرق آجاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا ذہن ہر وقت حرکت اور سیلان میں رہتا ہے حتیٰ کہ سوتے جاگتے میں بھی اُس کا عمل جاری رہتا ہے جس کے باعث ہم خواب دیکھتے ہیں۔ ابھی ہم آج کی کوئی بات سوچ رہے ہوتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے میں ہمارا خیال اپنے بچپن کے کسی واقعے کی طرف مُنتقل ہو جاتا ہے اور پھر معاً ہم مستقبل کے اِرادے باندھنے لگتے ہیں۔ یہی ذہن کی سیلانی حرکت ہے جو ہماری نفسیاتی صحت مندی کو بحال رکھتی ہے۔ جب کبھی ہماری ذہنی اُلجھنیں جنہیں ہماری اَنا یا ہمارا شعور ہمارے لاشعور میں دبائے رکھتا ہے، بے اختیار ہمارے شعور کی سطح پر اُبھر آتی ہیں تو شعور کی رَو مُتاثر ہو جاتی ہے، اُس کی سیلانی حرکت میں فرق آجاتا ہے اور ہمارا ذہن کسی ایک ہی سطح پر اِس طرح جامد ہو جاتا ہے کہ اُس کے بغیر کوئی بات سوچ ہی نہیں سکتا۔ یہی خللِ ذہن کی علامت ہے۔ ہماری خوش قسمتی سے یہ حالت شاذ و نادر ہی برقرار رہتی ہے اور ہمارے ذہن کی سیلانی حرکت بحال ہو جاتی ہے۔ یہ حرکت مستقلاً منقطع ہو جائے تو خللِ ذہن کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے جس کی کئی صورتیں ہیں۔ (۱)ـــــ ہسٹریا (۲)ـــــ عصبی المزاجی، پژمُردگی، مُنقسم شخصیت اور جسم کے مختلف اعضاء میں درد کی شکایت اِس کی علامتیں ہیں۔ (۳)ـــــ فتورِ ذہن: جس میں نامعلوم اندیشے اور خوف شامل ہیں منجملہ یہ کہ ساری دُنیا میری دشمن ہے اور سب لوگ میرے درپئے آزار ہیں۔ (۴)ـــــ تشویش: آدمی بلا کسی معقول وجہ کے ہر وقت تشویش میں مُبتلا رہتا ہے مثلاً یہ کہ کمرے کی چھت مُجھ

پر گر پڑے گی یا ٹرین جس میں میں سفر کر رہا ہوں حادثے کا شکار ہو جائے گی اور ان اندیشوں کے ساتھ آدمی اپنی موت کے مناظر کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ (۵)___ ہر وقت اپنی بیماری کا رونا روتے رہنا۔ اس کی تہ میں رحم طلبی ہوتی ہے جو دماغی کمزوری کی علامت ہے۔ خلل ذہن کا علاج تحلیل نفسی سے کیا جاتا ہے لیکن اب ایسی مسکّن دوائیں تیار کر لی گئی ہیں جو اکثر حالتوں میں مؤثر ثابت ہوتی ہیں۔

اَخلاطِ اربعہ

چار اَخلاط کا یہ تصوّر طبِ یونانی کے بانی ہپوقرطیس (بُقراط) سے یادگار ہے۔ انہی کی بنا پر چار مزاج متعیّن کئے گئے ہیں۔ دَموی، بلغمی، صَفراوی اور سوداوی۔ دَم عربی میں خون کو کہتے ہیں۔ دَموی مزاج والے کے جسم میں خونِ صالح بافراط ہوتا ہے اِس لئے وہ تندرست اور توانا ہوتا ہے۔ اُس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہوتا ہے اور آنکھوں میں گلابی ڈورے ہوتے ہیں۔ نہایت چاق و چوبند، خطر پسند اور بلند نظر ہوتا ہے۔ زندگی کے بارے میں اُس کا نقطۂ نظر رجائی ہوتا ہے اور وہ زندگی سے پوری طرح تمتّع کرتا ہے۔ اکثر اصحابِ عزم و عزیمت اِس مزاج کے ہوتے ہیں۔ بلغمی مزاج والا سفید فام اور فربہ اندام ہوتا ہے۔ خوش مزاج لیکن کاہل اور آرام طلب ہوتا ہے، زیادہ تگ و دَو اور بھاگ دوڑ سے گریز کرتا ہے، ہر ایک سے مسکرا کر بات کرتا ہے اور خوش رہو اور خوش رہنے دو کا قائل ہوتا ہے۔ صَفراوی مزاج والے کا رنگ زرد ہوتا ہے، اُس کا جسم دُبلا پتلا ہوتا ہے، نہایت حساس اور زود رنج ہوتا ہے۔ بات بے بات جھگڑے اور اختلاف کا کوئی نہ کوئی عنوان پیدا کر لیتا ہے جسمانی لحاظ سے توانا نہیں ہوتا اور سرکہ جبینی کے باعث اچھا دوست نہیں بن سکتا۔ جفاکشی اور ہمت کوشی اس میں نہیں ہوتی اور طبعاً حاسد ہوتا ہے۔ سوداوی مزاج والے کے چہرے کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھوں سے وحشت جھلکتی ہے اور میل جول سے گھبراتا ہے۔ تنہائی پسند ہوتا ہے اور اکثر گُم سُم اور کھویا کھویا رہتا ہے، گہری نیند سے محروم ہوتا ہے، اُس کی طبیعت پر افسردگی کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ زندگی کے تاریک پہلو کو دیکھتا ہے۔ رُوس کے مشہور عالم عضویات پاولوف نے ایک مدت تک کتوں پر تجربے کئے اور ہپوقرطیس کے چار مزاجوں کے اِس نظریّے پر صاد کیا تھا۔

اِخلال

لغوی معنیٰ ہیں نقصان پہنچانا، محتاج کرنا۔ اِنتقاد کی اِصطلاح میں اِس کا مطلب ہے کسی شعر میں الفاظ کو یوں بے ترتیب اور مضمون کی کڑیوں کو یوں غیر مربوط کر دینا کہ شعر کا مفہوم خبط ہو جائے۔ یہ خامی متشاعروں کے کلام میں ہوتی ہے جو قادر الکلام نہ ہونے کے باعث اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار صاف سیدھے پیرائے میں نہیں کر سکتے ہیں اور اپنے اہمال و ابہام پر فکر کی گہرائی کا پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اِخلاقیات

اِخلاقیات یا اِخلاق کا فلسفہ شروع سے فلسفے کا ایک اہم شعبہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ اخلاقیات انسانی اعمال کے مقاصد کی قدر و قیمت کو جانچنے کے لئے اُصولوں کے تعیّن کا علم ہے۔ اِس میں خَیر کی ماہیت سے بحث کی جاتی ہے اور اُس کے حصول کے وسائل کا تجزیہ کر کے بتایا جاتا ہے کہ وہ کس حد تک خَیر کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ قدمائے یُونان کے خیال میں مَسرّت کا حصول ہی اِنسانی زندگی کا واحد مقصد ہے البتّہ مَسرّت کے معانی میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سُوفسطائی اور اُن کے ہم نوا کہتے تھے کہ مَسرّت جذبات اور حواس کی تسکین سے میسّر آتی ہے جب کہ سقراط اور اُس کے پیرو عقلِ استدلالی کو مَسرّت کے حصول کا وسیلہ مانتے تھے۔ سُوفسطائیوں کے ہم خیالوں کو لعد میں لذّت پسند کہا گیا جس کی بہترین مثال ابیقورس تھا۔ افلاطون نے حُسن اور صداقت کی طرح خَیر کو بھی قدرِ اعلیٰ قرار دیا اور کہا کہ حُسن اور صداقت کی طرح خَیر کا حصول بھی عقلِ استدلالی ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔ افلاطون نے لذّت کو مَسرّت کا عُنصرِ ترکیبی ماننے سے انکار کیا۔ اِس کے مکالمات میں سقراط کہتا ہے کہ علم ہی خَیر ہے یعنی جو شخص خَیر کا علم رکھتا ہو وہ کوئی غیر اخلاقی حرکت کر ہی نہیں سکتا۔ اِس پر گرفت کرتے ہوئے ارسطو نے کہا کہ سقراط نے جذبات و احساسات کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ اُس کے بقول یہ بات عین ممکن ہے کہ آدمی خَیر کی حقیقت کو جانتے ہوئے بھی جذبات کے جوش میں آ کر غیر اخلاقی حرکات کا ارتکاب کر بیٹھے۔ ارسطو نے حظِ نفس کی اہمیّت سے انکار

نہیں کیا۔ اُس کے خیال میں ایک فعل کو اِس لئے نیکی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حظِ نفس کا باعث ہوتا ہے بلکہ نیکی ہونے کے سبب ہی اُس میں حظِ نفس کا عنصر پیدا ہوتا ہے۔ اِس طرح حظِ نفس محض ضمنی اور ذیلی شے ہے۔ نیکی کی زندگی گذارنے والا شخص از خود حظ و مسرّت سے بہرہ یاب ہو جاتا ہے جیسے ایک صحت مند نوجوان کے رخساروں پر خود بخود لالی دمکنے لگتی ہے۔ ارسطو کے یہاں بھی انسانی اعمال کا عقلِ استدلالی پر مبنی ہونا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پُر جوش جذبات پر اچھی عادتوں سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ اُس نے اچھی عادات کو تہذیبِ اخلاق کے لئے لازم قرار دیا ہے۔ قدمائے یونان دو انتہاؤں کے مابین صداقت کی تلاش کیا کرتے تھے یعنی اعتدال اور توافق کو فکر و عمل میں اہمیت دیتے تھے۔ اِسی اصول کی بنا پر ارسطو نے کہا ہے کہ نیکی دو انتہاؤں کے درمیان ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اِعتدال ہی نیکی ہے۔ سُقراط کے پیروؤں میں ارسطائی پس نے حصولِ مسرّت کے لئے لذّت اندوزی کو اہمیت دی اور کلبیوں نے ترکِ لذات کو مؤثر قرار دیا۔ بعد میں ابیقورس اور زینو رواقی کے پیروؤں نے اُن کی تقلید کی۔ ابیقورس کے خیال میں لذت مسرّت کا لازمی حصّہ ہے جب کہ رواقیئین کے یہاں وہی عمل نیکی کہلاتا ہے جو عقلِ استدلالی پر مبنی ہو۔

جدید فلسفے کے آغاز پر ہابس نے کہا کہ خیر اور شر کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے بلکہ اِن کی حیثیت اِضافی ہے۔ لاک نے اُس کی پیروی میں کہا کہ ذاتی مفاد و مسرّت کا تحفظ کرنا ہی اخلاقی عمل کا معقول مقصد ہو سکتا ہے۔ لارڈ شیفٹسبری نے ذاتی مفاد کے ساتھ اجتماعی مفاد کی پاسبانی کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ افادیّت پسند جیسے، الیس مِل کے خیال میں ہر شخص حظِ نفس کے حصول کا آرزو مند ہوتا ہے اِس لئے حظِ نفس ہی کو انسانی اعمال کا مقصد بنانا ضروری ہے۔ افادیّت پسندوں نے فرض کر لیا کہ اگر وہ ذاتی حظِ نفس کے حصول میں کوشاں رہے تو اِس سے دوسرے افراد بھی خود بخود حظِ نفس سے بہرہ ور ہو جائیں گے لیکن عملی دُنیا میں یہ بات ممکن نہیں ہے۔ ذاتی حظِ نفس کے حصول کی کوشش کرنے والا شخص لازماً خود غرضی کا شکار ہو جائے گا اور دوسروں کی فلاح و بہبود کو پس پشت ڈال دے گا۔ خود غرضی اور عمومی فلاح باہم متضاد ہیں دوسری طرف کانٹ

نے "فرض برائے فرض" پر زور دیا۔ وہ کہتا ہے کہ جو شخص عقلاً یا اخلاقاً کوئی فعل کرتا ہے تو اُسے یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ میرے اس فعل کے نتائج کیا ہوں گے۔ اِسے کانٹ کا حکمِ قاطع کہتے ہیں اور اِس میں رواقیئین ہی کے اخلاقی نصب العین کو نئی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

ہمارے زمانے میں اخلاقیات کے دو مکاتیب سامنے آئے ہیں (۱) فطرت پسندی کا مکتب اور (۲) وجدانیت کا مکتب۔ پہلا مکتب سائنس کے انکشافات پر مبنی ہے جس میں اخلاقی قدروں کے ازلی وابدی یا معروضی ہونے سے انکار کیا گیا ہے۔ اِس کی رُو سے اخلاقی قدریں سراسر موضوعی ہیں اور بچہ ماحول کے اثرات جذب کر کے اعمال کے حسن و قبح یا نیک و بد کے تصوّر سے آشنا ہوتا ہے۔ وجدانیّت مذہب پر مبنی ہے اِس کی رُو سے ضمیر خیر و شر کی تمیز بچے کے ذہن و قلب میں وہبی طور پر موجود ہوتی ہے۔ وہ اِن کا کسب نہیں کرتا بلکہ شعور کی بیداری کے ساتھ از خود اِن میں تفریق کرنے لگتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں خیر و شر معروضی ہیں۔ جدید طبیعیات کے انکشافات سے اخلاقی قدروں کے موضوعی اور اضافی ہونے کا تصوّر پیدا ہوا ہے اور نئے عمرانی نظریات کے پیشِ نظر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ فرد معاشرے کا ایک رُکن ہونے کی حیثیّت سے اجتماعی فلاح کے لئے جدّ و جہد کئے بغیر ذاتی و انفرادی حیثیّت میں مسرت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ قُدمائے یونان بھی سیاسیات اور اخلاقیات کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں سمجھتے تھے اُن کا خیال تھا کہ فرد معاشرے کا رکن ہو کر ہی انسان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اور سیاسی وسائل سے منصفانہ معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ سیاسی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے جو معاشرہ عدل و انصاف پر مبنی نہ ہو اُس میں مثبت اور تعمیری اخلاقی قدریں پنپ نہیں سکتیں نہ افراد کو محض زبانی کلامی نیکی کی تلقین کر کے نیک بنایا جا سکتا ہے۔ انسان اُسی معاشرے میں با اخلاق اور با مسرّت زندگی گذار سکتا ہے جس کے افراد اپنی اپنی وہبی صلاحیتوں کے مطابق ذاتی مفاد کے لئے نہیں بلکہ اجتماعی مفاد کے لئے کام کر رہے ہوں اور اُنہیں اِس بات کا شعور ہو کہ وہ دوسروں کو مسرّت کا سامان بہم پہنچا کر ہی خود بھی مسرّت سے بہرہ یاب ہو سکتے ہیں۔

اِخوان الصفا و خلّان الوفا

عباسی دور میں ایرانی عالموں کی ایک خفیہ انجمن کے ارکان تھے۔ اِن کا تعلق فرقۂ باطنیہ سے تھا۔ انہوں نے مِل کر دسویں صدی کے اواخر میں ۵۱ رسائل تصنیف کئے گویا اُس زمانے کے مُروجّہ علوم کی انسائیکلو پیڈیا مُرتّب کی۔ اِن میں سب سے مشہور رسالہ شرف الانسان ہے جو اِس مجموعے کے دوسرے حصّے کا آٹھواں رسالہ ہے۔ اِن رسائل میں نو فلاطونی فلسفے کے گہرے اثرات مِلتے ہیں۔ اِخوان الصفا کا الٰہیاتی نظریّہ یہ تھا کہ وجُودِ احد سے سب سے پہلے عقلِ اوّل کا صدور ہوا جس سے نفسِ کُل نکلا اور نفسِ کُل سے مادہ صادر ہوا جس سے کائنات بنائی گئی۔ نفسِ کُل کائنات میں ہر کہیں جاری و ساری ہے اور اِسی کے باعث یہ کائنات قائم ہے۔ افراد کی رُوحیں موت کے بعد دوبارہ نفسِ کُل کو لوٹ جاتی ہیں۔ اِخوان الصفا، قرآنی آیات کی تاویل کر کے اِن کے مطالب کو مُروجہ علوم پر ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے۔ رسائل میں الٰہیات، سائنس، فلسفہ، اخلاقیات، علمِ نجوم، فلکیات، طب، موسیقی، فقہ، تفسیر اور تصوّف پر بحثیں مِلتی ہیں۔ یہ رسائل اکثر اِبنِ سینا کے مطالعے میں رہتے تھے۔ غزالی نے اِن کی تکفیر بھی کی اور اِن سے اِستفادہ بھی کیا۔ اِن رسائل کو ۱۱۵۰ء میں بغداد میں بر سرِ عام نذرِ آتش کیا گیا۔ اِخوان کا رئیس زید بن رفاعہ تھا۔ دوسرے مُصنفین میں ابو سلیمان محمد بن نصر البسطی المقدسی، ابو الحسن علی بن ہارون الزنجانی، ابو احمد النہر جوری اور العوفی کے نام ہم تک پہنچے ہیں، باقی کے احوال پر گُمنامی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔

اَدب

اَدبی تحریر وہ ہوتی ہے جس میں لکھنے والا اِظہارِ ذات کرتے ہوئے جو حظ و مسرّت محسوس کرتا ہے وہی پڑھنے والے کو بھی محسوس ہو۔ ذوق یا حظ و مسرّت واحد معیار ہے جس سے ہم ادبی اور غیر ادبی تحریروں میں فرق کر سکتے ہیں۔ ادب کی اِصناف میں لوک بت کہاؤ، لوک کہانیاں، جاتک کہانیاں، داستان، ناول، تمثیل، مختصر افسانہ، دیو مالائی قصّے، اِنشائیہ، خود نوشت سوانح حیات، مُراسلات، طنزیہ و مزاحیہ تحریریں، سفر نامے، رپورتاژ، خاکے وغیرہ شامل ہیں۔

اِدراک

جب ذہن کسی حِس کی ترجمانی کرتا ہے تو وہ اِدراک بن جاتی ہے۔ مثلاً کسی آدمی کی اُنگلی آگ سے چھُو جائے تو یہ حِس ہوگی لیکن پلک جھپکنے میں ذہن اِس حِس کی ترجمانی کر کے ہاتھ کھینچ لینے کا حکم دے گا اِسے اِدراک کہیں گے۔ یہ وقفہ اتنا کم ہوتا ہے کہ بعض علمائے نفسیات حِس اور اِدراک میں فرق ہی نہیں کرتے۔

آدم

آدم کا لفظ ADAMAS سے ہے جس کا معنیٰ ہے سخت، جیسا کہ انگریزی کے لفظ ADAMENT میں ہے۔

اَدونِس

کنعانی بابل کے دیوتا تموز کو آدون (آقا) کہتے تھے جسے یونانیوں نے اَدونِس بنا لیا۔ فریگیا میں اِس کا نام اتیس تھا۔ اَدونِس بار آوری کے متوں میں زرعی نشو و نما کا علامتی مظہر تھا۔ جے، جی فریزر نے اَدونِس کے قِصّے پر ایک کتاب اَدونِس نام کی لکھی تھی جس میں کہتا ہے کہ اَدونِس ایک جوان رعنا تھا جس پر حُسن و عشق کی دیوی افرودائتی اور موت کی دیوی پرسی فونی فریفتہ ہو گئیں۔ مریخ دیوتا بھی افرودائتی سے عشق کرتا تھا۔ اُس نے حسد سے جل کر خنزیر کا رُوپ دھار لیا اور اَدونِس کو مار ڈالا۔ خداوند خدا زیوس نے افرودائتی اور پرسی فونی میں اِس شرط پر صلح کرا دی کہ اَدونِس چھ ماہ تک پرسی فونی کے یہاں اُس کے زیر زمین دوزخ محل میں قیام کرے گا اور بہار کی آمد کے چھ ماہ بعد تک افرودائتی کے آغوشِ شوق کی زینت بنے گا۔ اَدونِس کا سالانہ تہوار مصر میں اوزیرس اور عزا، بابل میں تموز اور عشتار، شام میں اَدونِس اور عشترتی اور فریگیا میں اتیس اور سائبیلی کے ناموں سے منایا جاتا تھا۔ فنیقیہ، قبرص اور ایتھنز میں اَدونِس کی المناک موت کی یاد میں عورتیں ماتمی جلوس نکالتی تھیں اور زور شور سے سینہ کوبی اور نوحہ خوانی کرتی ہوئی بازاروں کا چکر لگاتی تھیں۔ بعض تماشائی اَدونِس کے غم میں از خود رفتہ ہو کر اپنے آپ کو چھُریوں سے زخمی کر لیتے تھے۔ جلوس کے

خاتمے پر بڑا پروہت ماتیوں کو بشارت دیتا تھا کہ مبارک ہو اُدونس دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ اس پر خوشی کے شادیانے بجائے جاتے۔ عورتیں مرد مِل کر دیوانہ وار ناچتے اور جنسی بے راہ روی کے مظاہرے کئے جاتے تھے۔ جے۔ جی فریزر کے خیال میں جناب عیسیٰ کی حیاتِ نو، مسیحا اور فارقلیط کے تصورات اسی دیو مالائی روائت سے لئے گئے ہیں۔ عربوں نے آدون کا نام نعمان رکھ لیا جس کا معنیٰ ہے محبوب۔ کہتے ہیں کہ جس جگہ اُدونس کا خون گرا تھا وہاں لالے کے پھول اُگ آئے تھے چنانچہ عرب لالے کے پھول کو شقائق النعمان (نعمان کے زخم) کہتے ہیں۔

آدی واسی

ہندوستان کے اصل قدیم باشندے۔ اِن میں لواریا، بھنتو، ہبورا، بھیڈ گھٹ، ڈوم، ہرنی، کنجر، نٹ، کرول، مینا، سانسی، پکھی وارا، چڑی مار، پاسی، گگڑے، گلوے، بھیل اور مُنڈا شامل ہیں۔

اِرادیّت

کانٹ نے کہا تھا کہ حقیقت کا اِدراک ناممکن ہے۔ شوپنہائر نے کہا ارادہ ہی حقیقت ہے اِس سے اِرادیّت کی تحریک کا آغاز ہوا جس نے نطشے، برگساں، جیمز وارڈ اور ڈیوی کے افکار کو متاثر کیا۔ شوپنہائر کے خیال میں آفاقی اندھا اِرادہ ہر شے کا سبب ہے اور کائنات کا تخلیقی اصول ہے۔ یہ نظریہ مثالیت ہی کی ایک صورت ہے۔ شوپنہائر اِرادے کے مقابلے میں عقل و خِرد کو حقیر و صغیر سمجھتا ہے۔ گوتم بدھ کے بعد شوپنہائر قنوطیوں کا سب سے بڑا اِمام ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندہ رہنے کی خواہش ہی انسان کے آلام و مصائب کا سبب ہے اگر اِنسان تجرّد کی حالت میں زندگی گذارے اور بچے پیدا نہ کرے تو ارادۂ حیات کو شکست دی جا سکتی ہے۔

اَرارات

آرمینیا کا ایک پہاڑ جس کی چوٹی پر روایت کے مطابق کشتیٔ نوح رُکی تھی۔

اِرتقاء

نظریۂ اِرتقاء انگریز سائنس دان ڈاروِن سے منسوب ہے۔ لیمارک نے کہا تھا کہ جب کبھی کوئی

حیوان کسی نئے عضو کی ضرورت محسوس کرتا ہے یا اِس کی خواہش کرتا ہے تو اُس کے بدن میں اِس عضو کا اضافہ ہو جاتا ہے ۔ ڈارون نے اِس داخلی اصولِ ارتقاء کو غیر علمی قرار دیا ۔ وہ صرف خارجی ماحول سے بحث کرتا ہے ۔ فلاسفۂ یونان اصولِ ارتقاء کے قائل نہیں تھے ۔ عہدِ سُقراط سے پہلے کے ایک فلسفی اناکسی مینڈر کے یہاں البتّہ ارتقاء کے مبادیات کی جھلک دکھائی دیتی ہے ۔ ۱۹ ویں صدی میں طبیعی عُلوم کو ترقی ہوئی تو ذی حیات پر طبیعی قوانین اور تاریخ پر حیاتیات کے اُصولوں کا اطلاق کیا گیا تو ڈارون نے ارتقاء کا نظریّہ پیش کیا ۔ اُس کا نظریّہ مالتھس کے آبادی کے نظرّیے پر مبنی ہے جس کی رُو سے ذی حیات اِس تیز رفتاری سے بچّے پیدا کرتے ہیں کہ سب کو خوراک میسّر نہیں آسکتی اِس لیئے زندہ رہنے کے لیئے انواع میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے ۔ اِس کشمکش کے تصوّر سے ڈارون کے نظرّیے کا آغاز ہوتا ہے ۔ انسان کے اصل کی جستجو کرتے ہوئے ڈارون نے کہا کہ انواع میں زبردست جہد للبقا جاری ہے ۔ جو جانور خارجی ماحول سے موافقت پیدا کر لیتے ہیں وہ باقی رہتے ہیں دوسرے مٹ جاتے ہیں ۔ زندہ بچنے والوں کو لبقائے اصلح کا نام دیا گیا ۔ طبیعی ماحول بدلتا رہتا ہے ۔ اِن تغیّرات کے دوران میں انواع دوسرے انواع میں بدل جاتے ہیں تاکہ نئے ماحول میں زندہ رہ سکیں ۔ اِس عمل کو انتخابِ طبیعی کہا جاتا ہے یعنی نیچر اُن خاصیتوں کا انتخاب کر لیتی ہے جن کی مدد سے انواع نئے ماحول میں زندہ رہ سکتی ہیں اور اُن خامیوں کو مٹا دیتی ہے جو زندہ رہنے میں رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں ۔ اِس نظرّیے کی رُو سے برف کے طویل زمانوں میں نامساعد ماحول کے خلاف کشمکش کرتے ہوئے بنی نوع انسان کا ذہنی جوہر ترقی کر گیا جس کے طفیل وہ ماحول سے موافقت کرنے کے قابل ہو گئے جب کہ دِنوسار جیسے کوہ پیکر جانور ماحول کے ساتھ موافقت نہ کر سکے اور فنا کے گھاٹ اُتر گئے ۔ اِس تحقیق سے ڈارون نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ انسان کا ترقی یافتہ ذہنی جوہر ہی اُسے دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتا ہے ورنہ اصلاً وہ چمپانزی ، گوریلا اور اورنگ اوٹنگ ہی کے کنبے کا ایک حیوان ہے ۔ انسان اور چمپانزی کے درمیان جو حیوان ضروری واسطہ تھا اُس کا کھوج ڈارون نہ لگا سکا اِس لیئے اُسے " زنجیر کی کھوئی ہوئی کڑی " کا نام دیا ۔ آج کل کے عُلماء کے خیال میں جاوا اور پیکن سے جو نیم حیوانی نیم انسانی

کھوپڑیاں ملی ہیں اُن سے اِس کھوئی ہوئی کڑی کا سراغ مِل گیا ہے۔

ڈارون کی معرکہ آرا کتاب ' اصلِ انواع ' کی اشاعت سے مذہبی حلقوں میں کہرام مچ گیا اور پیدائش کے بارے میں کلیسیا کے بنیادی عقائد متزلزل ہو گئے۔ عہد نامۂ قدیم کی رُو سے خدا نے انسان کا پُتلا بنا کر اُس میں رُوح پھونکی تھی اور اِس پُتلے کی پسلی سے حوّا کو پیدا کیا تھا۔ ہکسلے اور دوسرے سائنس دانوں نے ڈارون کی حمایت میں اہلِ کلیسیا سے بحث و مُجادلہ کا بازار گرم کیا۔ اَب یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے کہ انسان آسمان سے پستی میں گرا ہوا کوئی فرشتہ نہیں ہے بلکہ زمین کی پستیوں سے بلندیوں کی طرف اُٹھتا ہوا حیوان ہے۔

آرتی

آرتی کا لغوی معنیٰ ہے 'تکلیف'۔ آرتی پانچ یا سات بتیوں والا پیتل کا چراغ ہوتا ہے جسے روشن کر کے دیوتا یا راجہ کے چہرے کے سامنے گھُما یا پھرایا جاتا ہے تاکہ وہ نظرِ بد سے محفوظ رہیں۔ آرتی صرف سُہاگن، نرتکی یا دیشیا ہی اُتار سکتی ہے۔ جب راجہ دربار سے اُٹھ کر آتا تو اُس کی آرتی اُتاری جاتی تھی۔ خیال یہ تھا کہ راجہ کے چہرے پر سیکڑوں لوگوں کی نظریں پڑتی ہیں ممکن ہو سکتا ہے کہ دیکھنے والوں میں کوئی نظرِ بد رکھنے والا بھی ہو جس کے چشم زخم سے راجہ کو گزند پہنچے۔ دیوتاؤں کی آرتی بھی اِسی مقصد کے لئے اُتارتے ہیں۔

ارجان

جَین فرقے کی تارک عورتیں۔

ارغواں

سُرخ رنگ کا نہایت خوبصورت پھُول جو کابل کے نواح میں ہوتا ہے۔ اِس کی جھاڑی پیڑ جتنی اُونچی ہوتی ہے بابر نے تزکِ بابری میں اِس کا ذکر کیا ہے۔ بابر کے مزار کے نواح میں آج بھی ارغواں کے پھُول کھِلتے ہیں۔

ارغوانی رنگ

یہ لال چھپا رنگ قدیم زمانے کے کنعانی صدفِ ماہی کے سیال مادے سے نکالتے تھے۔ اِس میں

رنگے ہوئے ریشمی کپڑے نہایت بیش قیمت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ہیلن اور کلیوپیٹرا کا مرغوب رنگ تھا۔ ارغوانی کے علاوہ قرمزی رنگ بھی کنعانیوں ہی نے دریافت کیا تھا۔ یہ رنگ اُن کیڑوں سے بنایا جاتا تھا جو شاہ بلوط کی ایک خاص قسم سے حاصل کیے جاتے تھے۔

ارواح کا مت

جیسا کہ آج کل کے آسٹریلیا اور افریقہ کے جنگلی قبائل کے مشاہدے سے انکشاف ہوا ہے کہ ماقبل تاریخ کا انسان بھی رُوح کو ہوا کا جھونکا یا سانس ہی سمجھتا تھا۔ وہ دیکھتا کہ جب اُس کا کوئی عزیز بیمار پڑ جاتا اور اُس کی سانس رُک جاتی تو وہ مر جاتا تھا۔ اِس سے اُس نے اندازہ لگایا کہ سانس یا ہوا کا جھونکا ہی زندگی یا رُوح ہے۔ اِس کا رشتہ ٹوٹ جانے سے زندگی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ آج بھی دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں رُوح کے لئے جو الفاظ ملتے ہیں اُن کا لغوی معنیٰ ہوا کا جھونکا ہی ہے مثلاً قبطی میں کنف، عبرانی میں رواح، عربی میں رُوح، یونانی میں سائکی، لاطینی میں انیما، سنکرت میں آتما کا معنیٰ ہوا کا جھونکا ہے۔ انسان کے شعور کی بیداری کے ساتھ اُس کا رُوح کا تصور بھی بدل گیا۔ وہ دیکھتا کہ رات کو جب وہ اپنے غار میں سو جاتا ہے تو حالتِ خواب میں اِدھر اُدھر جنگلوں میں گھومتا پھرتا ہے، شکار کھیلتا ہے، اپنے مرے ہوئے عزیزوں سے مُلاقاتیں کرتا ہے لیکن صبح سویرے جاگنے پر وہ اپنے غار ہی میں موجود ہوتا ہے۔ وہ سوچنے لگتا کہ میرے اندر کوئی ہستی ایسی بھی ہے جو سوتے میں جسم سے نکل کر اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی ہے۔ ہمزاد کا خیال اِسی قیاس آرائی سے یادگار ہے۔ بہر حال اب رُوح ہوا کا جھونکا نہ رہی بلکہ ایک پورے قدوقامت، ڈیل ڈول اور چہرے مُہرے والی ہستی بن گئی جو سوتے میں اور مرنے کے بعد ـــــ قدیم انسان موت کو لمبی نیند ہی سمجھتا تھا ـــــ اِدھر اُدھر آجا سکتی ہے۔ کئی توہمات اِس خدشے سے یادگار ہیں کہ کہیں یہ ہستی یا رُوح جسم سے نکل نہ بھاگے چنانچہ ہندو جمائی لینے پر آج بھی جے نارائن کہتے ہیں۔ چھینک آنے پر عیسائی کہتے ہیں "خدا تمہیں برکت دے" اور مسلمان یرحمک اللہ کہتے ہیں۔ اپنی طفلانہ تخیل آرائی کے باعث ـــــ بچے کھلونوں کو اپنی ہی طرح زندہ سمجھ کر اُن سے باتیں کرتے ہیں ـــــ قدیم انسان نے جانوروں،

پرندوں، درختوں، پہاڑوں، ندی نالوں، سورج، چاند کو بھی اپنی ہی طرح کی ذی حیات اور ذی روح ہستیاں قرار دیا۔ یہی اَرواح کا مت تھا جس کے اثرات آج بھی مذہب، تصوف، فلسفہ، نفسیات اور علم الانسان میں مطالعہ کیئے جا سکتے ہیں۔ مذہب کی ابتدا اِسی سے ہوئی۔ اِنسان نے آسمان، زمین، سورج وغیرہ کو اپنے آپ پر قیاس کرتے ہوئے اُنہیں زندہ قرار دیا۔ اِن میں آسمان سورج اور چاند مہربان دیوتا بن گئے جو بادل برساتے تھے یا روشنی بخشتے تھے۔ دھرتی کی کوکھ سے فصلیں اُگتی تھیں اِس لئے اُسے ماں کہنا شروع کیا، آسمان باپ بن گیا۔ اُنہیں خوش کرنے کے لئے قربانیاں دینے کا رواج ہوا۔ گرج چمک، طوفان کے دیوتا خوفناک تھے اِس لئے اُنہیں راضی رکھنا بھی ضروری تھا۔ اِس مقصد کے لئے وہ اُن پر چڑھاوے چڑھانے لگا۔ مرے ہوئے لوگوں میں بعض اُس کے دوست اور عزیز تھے اور بعض خطرناک دشمن تھے اِس سے روحوں کو نیک اور بد یا شقی اور سعید میں تقسیم کیا گیا۔ خیال یہ تھا کہ بد روحیں اِنسان کے اندر گھس کر اُسے امراض میں مُبتلا کر دیتی ہیں، راتوں کو آکر اُسے ڈراتی ہیں، راستے سے بھٹکا دیتی ہیں۔ بھوت، عفریت، غول وغیرہ کے تصورات اِنہی بد اَرواح سے یادگار ہیں۔ مرورِ زمانہ سے دیوتاؤں کی پوجا میں بد اَرواح اور نیک اَرواح کی استرضا بھی شامل ہوگئی۔ اِس دور کے اِنسان کی سوچ یہ تھی کہ نیند کی حالت میں رُوح جسم سے الگ ہو کر اِدھر اُدھر کے چکر لگا کر واپس آجاتی ہے لیکن لمبی نیند یا موت کے بعد وہ کسی اور عالم میں جا کر وہاں مستقل سکونت اختیار کر لیتی ہے البتہ دعوت کرنے پر یہ اَرواح پھر اُس کے یہاں آجاتی ہیں۔ موت کے بعد رُوح کی بقا کا یہ تصوّر مذہب کا سنگ بُنیاد بن گیا۔ مصریوں، سُمیریوں، بابلیوں، چینیوں وغیرہ میں شروع سے حیات بعد موت کا تصوّر باقی رہا ہے۔ مصری اپنے مُردوں کے جسم کی ممّی بنا کر اُنہیں محفوظ کر لیتے تھے تاکہ با (رُوح) تین ہزار برسوں کا چکر لگا کر واپس اپنے جسم میں آئے تو اُسے ثابت و سالم پائے۔ چینیوں اور تاتاریوں کے یہاں بادشاہ کے مرنے پر اُس کی کنیزیں، گھوڑے اور دوسرا ساز و سامان اُس کی میت کے ساتھ دفن کر دیتے تھے کہ اگلی زندگی میں اُسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ ہندوؤں میں عورت شوہر کی چتا پر جل کر ستی ہو جاتی تھی تاکہ اگلے جہان میں وہ

اُس کی جدائی سے پریشان نہ ہو۔ ہندوؤں کا آواگون یا سنسار چکر کا نظریہ بھی اسی مفروضے پر مبنی ہے کہ انسانی رُوح نیک یا بد اعمال کی رعایت سے نیا قالب اختیار کر لیتی ہے۔ سائنٹیفک نفسیات کی رُو سے رُوح کا انسانی ذہن و شعور سے علاحدہ اپنا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ مغزِ سر کا فعل معطل ہو جانے پر ذہن و شعور بھی مِٹ مٹا کر رہ جاتے ہیں۔

اُزبک

مشہور تاتاری قبیلہ جس کے خان شاہی بیگ نے بابر کو فرغانہ اور سمرقند سے نکال دیا تھا۔ بعد میں کئی اُزبک شہسوار ہندوستان میں آ کر مغلوں کی فوج میں بھرتی ہوتے رہے۔ یہ لوگ بڑے سرکش اور شوریدہ پُشت تھے۔ پنجابی میں اُجبک احمق کو کہتے ہیں۔

اَزلی گناہ

اَزلی گناہ کا تصور کلیسائے رُوم کے اہم عقائد میں سے ہے اور ولی آگسٹائن سے منسوب ہے۔ اس کی رُو سے آدم اور حوّا نے حکم خداوندی سے سرتابی کر کے جو گناہ کیا تھا وہ ہر بچّے کو ورثے میں ملتا ہے یعنی ہر شخص پیدائشی گناہ گار ہوتا ہے۔ جناب مسیح پر ایمان لانے ہی سے اس سے نجات حاصل ہو سکتی ہے کیوں کہ وہ منجی ہیں۔ کلیسائے رُوم کے آباء نے آدم اور حوّا کے سیب کھانے کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ سیب بکارت کی علامت ہے جو حوّا نے شیطان کے بہکانے پر آدم کو پیش کی تھی گویا جنسی ملاپ ہی وہ اَزلی گناہ ہے جو آدم اور حوّا سے سرزد ہوا تھا۔ اس لئے اس سے اجتناب ضروری ہے چنانچہ رومن کیتھولک پادری اور راہبات تجرّد کی زندگی گذارنے کا عہد کرتے ہیں۔ جنسی ملاپ کے ساتھ گناہ کا تصوّر وابستہ کرنے سے عیسائی شدید احساسِ گناہ میں مبتلا ہو گئے جو اُن کی رُوح کی گہرائیوں میں اُتر چکا ہے اور جس سے وہ جدید دور کی جنسی بے راہ روی کے باوجود نجات نہیں پا سکے۔

اِستقراء

اِستقراء کے لغوی معنی ہیں جستجوئے بلیغ کرنا۔ منطق کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے حقائق کے کامل مشاہدے کے بعد کلیات کا اِستخراج کرنا۔ اس کے برعکس قیاسی منطق میں پہلے کلیات

قائم کئے جاتے ہیں اور اُن کے حوالے سے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ اِن کا فرق ایک مثال سے واضح ہوگا۔ فرض کیجیے کہ ایک ٹوکری میں سیب ہیں۔ ہم نے دیکھنا ہے کہ یہ سیب تازہ ہیں یا گلے سڑے ہوئے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم ٹوکری کے اوپر کے دو چار سیب دیکھ کر اپنی رائے قائم کرلیں۔ اوپر کے سیب دیکھنے میں تازہ دکھائی دیں تو ہم قیاس کرلیں کہ سارے ہی سیب تازہ ہوں گے۔ یہ منطقِ قیاسی کا طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم ٹوکری کو اُلٹ دیں اور ایک ایک سیب کو غور سے دیکھیں۔ اگر سارے سیب تازہ ہوں تو ہم یہ نتیجہ اخذ کریں کہ یہ ٹوکری تازہ سیبوں کی ہے۔ اِس میں گلے سڑے سیب نکل آئے تو ہم اِس کے بارے میں یہ رائے قائم نہیں کر سکیں گے۔ یہی اِستقراء کا طریقہ ہے۔ قیاسی منطق ارسطو نے وضع کی تھی۔ اُس کا یہ قضیہ معلومِ عوام ہے۔

تمام اِنسان فانی ہیں
سُقراط اِنسان ہے
لہٰذا سُقراط فانی ہے

اِس میں مُشکل یہ ہے کہ کُلیّہ پہلے اختیار کیا جاتا ہے اور اِستدلال بعد میں کیا جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سارے کُلیے محولّہ بالا کُلیے کی طرح مُحکم ہوں اِس لئے اِحتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پہلے دقتِ مُشاہدہ سے کام لیں اور اِس طرح جو حقائق سامنے آئیں اُن کی بنا پر کُلیہ قائم کریں۔ یہی طریقہ سائنس کا بھی ہے۔ اِسی بنا پر فرانسس بیکن نے اِستقراء پر زور دیا تھا اور ارسطو کی منطقِ قیاسی کو رد کر دیا تھا کیوں کہ بقول اُس کے قیاس سے عِلمی تحقیق کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ اہلِ تحقیق نے فرانسس بیکن کے بعد اِستقراء کو اپنا لیا اور قیاسی منطق کو فرسودہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ لیکن قیاس کی اہمیت سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا۔ بعض سائنس دانوں نے قیاس کی بنا پر تحقیق کا آغاز کیا جو بعد میں درست ثابت ہوا۔ اتنا ضرور ہے کہ اِستقراء قیاس سے زیادہ قابلِ اعتماد طریقۂ جستجو ہے کہ اِس میں غلطی اور سہو کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی اور اِس سے اخذ کئے ہوئے نتائج کی صحت کو بر

کہیں جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

اِسرائیل

یہ لقب جناب یعقوب کا ہے اور اس کا معنیٰ ہے خُدا پر غالب آنے والا۔ عہد نامۂ قدیم میں لکھا ہے کہ جناب یعقوب نے خُدا سے کُشتی لڑی تھی اور اُسے عاجز کر دیا تھا اِس لئے اُنہیں اِسرائیل کہا گیا۔ جناب یعقوب کے بارہ بیٹوں کی اولاد بنی اِسرائیل کہلائی جب کہ اِن کے بھائی اسمٰعیل کی اولاد کو بنو اسمٰعیل کہا گیا۔ قریش مکہ بنو اسمٰعیل تھے۔

اُسلوبِ بیان

لکھنے والے کا ذہن صاف ہو گا تو اُس کا اُسلوب بیان بھی صاف اور عام فہم ہو گا۔ پراگندہ دماغ آدمی کی تحریر اُلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ شوپنہائر کا قول ہے "سلیس اور سادہ زبان میں نادر نکتے بیان کرنا: یہ ہے اسلوب بیان۔" کسی شخص کے اسلوب بیان سے اُس کی شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جن اُدبا کی تحریر خطیبانہ ہو اُن کے ہاں جدّتِ افکار کی کمی ہوتی ہے جس پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ مرصّع تراکیب اِستعمال کرتے ہیں۔

آسمان

آس: چکّی ، مان: مانند۔ یعنی چکّی کی مانند پھرنے والا۔ قدیم زمانے کے ہئیت دانوں کے خیال میں آسمان چکّر کھاتے ہیں اور اِنسان کے طالع پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ گردشِ فلک اور چرخِ چنبری کی تراکیب اِسی سے یادگار ہیں۔ آسمان آریا اقوام کا سب سے بڑا دیوتا تھا۔ رگ وید دیا اوہ (بعد کا وارونہ) آسمان دیوتا تھا۔ دیا اوہ کا معنیٰ ہے دکھائی دینے والا آسمان۔ وارونہ یونانیوں کا اورے نس بن گیا۔ بعد میں عیسائی خُدا کو آسمانی باپ کہنے لگے۔ مُغل اپنے آسمانی دیوتا کو تنگری کہتے تھے جس کا معنیٰ ہے "نیلا آسمان"۔ اُن کے خیال میں تنگری رُوحوں کا مسکن ہے۔

اِسکیمو

اِسکیمو کا لُغوی معنیٰ ہے "کچا گوشت کھانے والا"۔

آسن

سمادی کی نشست: جنسی اختلاط کے مختلف طریقوں کو بھی آسن یا بندھ کہا جاتا ہے۔ پنڈت وتسیان اور شیخ نفزاوی نے کم و بیش بتیس آسنوں کی تفصیل دی ہے۔

آسیب

بدارواح جن کی پکڑ سے مرگی کا دورہ پڑتا ہے۔ یہ توہم دُنیا بھر کی اقوام میں پایا جاتا ہے آسیب کو دفع کرنے کے طریقے بھی ملتے جلتے ہیں۔ ہمارے ہاں جس عورت پر آسیب کا سایہ پڑ جائے اُس کا نہان (غسل) کرایا جاتا ہے۔ عورتیں مٹی کے سات کورے برتنوں میں سات کنوؤں سے پانی بھر لاتی ہیں جس میں کئی پیڑوں کے پتے بھگوئے جاتے ہیں۔ ان برتنوں کو سُرخ رنگ کی صافیوں سے ڈھک دیتی ہیں۔ پھر آسیب زدہ عورت کو چوکی پر بٹھاتی ہیں اور اُس کے سر پر سُرخ رنگ کی چادر تان دی جاتی ہے۔ اس چادر میں سے پانی اُنڈیل کر عورت کو نہلاتی ہیں۔ اس کے بعد عورت کو کسی دریا یا تالاب کے کنارے جا کر غسل دیا جاتا ہے۔ نہان کے دوران میں آسیب اُتارنے والی عورت پہ وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ زور شور سے اپنا سر ہلانے اور گھمانے لگتی ہے۔ اس کے ہوش میں آنے پر مریضہ کا آسیب بھی دفع ہو جاتا ہے۔

اِشتراکیت

اِشتراکیت کا مطلب ہے ملکی پیداوار کی منصفانہ تقسیم یا دوسرے الفاظ میں شخصی املاک کا خاتمہ کر کے اجتماعی ملکیت کا نفاذ عمل میں لانا تاکہ پیداواری وسائل پر افراد کا تصرف ختم کر کے استحصال کا خاتمہ کیا جا سکے۔ اشتراکیت یا اِشتمالیت کا تصور نیا نہیں ہے۔ علم الانسان کے طلبہ ہمیں بتلاتے ہیں کہ ماقبل تاریخ کے شکار کے زمانے میں قدیم اِشتمالی معاشرہ ابتدائی صورت میں موجود تھا۔ زرعی انقلاب کے بعد ریاست معرضِ وجود میں آئی اور چند طاقت ور طالع آزماؤں نے اُس پر قبضہ کر کے ایسے قوانین وضع کئے جن سے اُن کے اِقتدار کا تحفظ مقصود تھا۔ جنگی قیدیوں کو جان سے مار دینے کی بجائے اُنہیں غلام بنا کر گھروں اور کھیتوں میں کام لینے لگے۔ غلامی کا یہ دور کئی صدیوں پر محیط ہے۔ اس کے بعد

جاگیرداری نظامِ معاشرہ صورت پذیر ہوا جو صنعتی انقلاب تک دُنیا کے بیشتر ممالک میں قائم رہا۔
سائنس کی ترقی اور صنعت کاری کے ساتھ پیداواری وسائل بدل گئے لیکن کارخانہ داروں نے پیداوار کے پُرانے علائق کو باقی و برقرار رکھا جس سے آقا اور غلام یا جاگیردار اور مزارعہ کا رشتہ، کارخانہ دار اور مزدور کے رشتے میں بدل گیا۔ حقیقت پسندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ پیداواری قوتوں کو پوری طرح پھلنے پھولنے کا موقع دیا جاتا اور مزدوروں کو بھی سائنس اور صنعت کے برکات میں برابر کا شریک کر لیا جاتا لیکن صنعت کاروں اور ساہوکاروں کی ہوسِ زر مانع ہوئی اور مزدوروں کا استحصال جاری رہا۔
انیسویں صدی میں یورپ کے صنعت کاروں کو اپنی مصنوعات کی فروخت اور کارخانوں کے لئے کچا مواد فراہم کرنے کے لئے منڈیوں اور نوآبادیوں کی تلاش ہوئی چنانچہ اہلِ مغرب نے ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک پر جارحانہ تاخت و تاراج کی۔ اِن نوآبادیوں میں مشنری بھیجے گئے تاکہ وہ ملکیوں کو عیسائی بنالیں۔ خیال یہ تھا کہ اِس طرح ہم مذہبی کے ناطے سے وہ اپنے آقاؤں کے خلاف بغاوت نہیں کریں گے۔ نوآبادیوں کی لُوٹ کھسوٹ اور بندر بانٹ پر اقوامِ مغرب ایک دوسری کی مخالف ہوگئیں اور اپنے اپنے معاشی مفادات کے تحفّظ کے لئے جنگ کی آگ بھڑکا دی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد پچاس سے زیادہ نوآزاد اقوام دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئیں۔ اہلِ مغرب کو انہیں سیاسی آزادی تو دینا پڑی لیکن اُنہوں نے مالی امداد کے نام پر اُنہیں بڑی بڑی رقموں کے قرضے دیے اور اِس طرح لوہے کی زنجیروں کی بجائے انہیں سونے کی زنجیریں پہنا دیں۔ ظاہر ہے کہ مُعاشی آزادی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہوتی ہے چنانچہ امداد کے نام پر مغرب کے سامراجی ساہوکار اور اِجارہ دار نوآزاد قوموں کا بدستور استحصال کر رہے ہیں۔
اٹھارویں صدی کے فرانسیسی اہلِ علم دی مابلی، دی موریلی، میزلیر اور دولباخ نے سلاطین اور پادریوں کے گٹھ جوڑ کی جانب توجّہ دلائی اور کہا کہ یہ طبقات مل کر عوام کا اِستحصال کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے متفقہ طور پر ذاتی املاک کو معاشرے کی تمام بُرائیوں کی جڑ قرار دیا۔ دیدرو نے کہا کہ جب تک آخری بادشاہ کو آخری پادری کی انتڑیوں سے پھانسی نہیں دے دی جائے گی انسان کے مصائب کا

خاتمہ نہیں ہوگا۔ میزلیر اپنی کتاب "عہد نامہ" میں کہتا ہے کہ موجودہ معاشرتی نظام شر پر مبنی ہے جس میں کروڑوں عوام فاقہ کشی کر رہے ہیں جب کہ گنتی کے چند اُمراء اُنہیں کی کمائی پر عیش و عشرت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ شخصی املاک چوری ہے، رہزنی ہے۔ مذہب، قانون اور تعلیم و تدریس کے اداروں سے اِس لوٹ کھسوٹ کے جواز اور اِس شرمناک اِدارے کے تحفظ کا کام لیا جا رہا ہے۔ ایسے انقلاب کی ضرورت ہے جس سے عوام کے خلاف اِس سازش کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ڈی مابلی نے لکھا "معاشرے کی تمام بُرائیوں کی جڑ شخصی املاک ہے اور انسان اشتمالی معاشرے ہی میں نیکی اور خوشی کی زندگی گذار سکتا ہے۔" اُس نے اپنی ایک کتاب "قانونِ فطرت" میں اِشتمالی نصب العین کی تشریح کی ہے۔ موریلی کہتا ہے کہ اِنسان بالطبع نیک ہے، پدری اور مادری جبلتیں اُسے نیک کاموں کی جانب مائل کرتی ہیں۔ مُقتدر طبقے کے بنائے ہوئے قوانین نے شخصی املاک کا اِدارہ مُستحکم کیا جس کے باعث اِنسان میں خود نمائی، تکبّر، جاہ طلبی، اِیذا رسانی اور ریاکاری کے معائب پیدا ہو گئے اور تعمیری جبلتیں دب کر رہ گئیں۔ حصولِ املاک کے ہَوَس نے تمام اخلاقی معائب کو تقویّت دی ہے اور اِنسان جو بالطبع نیک تھا خود غرض اور قابو چی بن گیا ہے۔ اگر انسان لالچ، حسد، رقابت اور منافرت سے مبرّا ہوتا جنہیں شخصی املاک نے ہوا دی ہے تو وہ امن اور چین کی زندگی گذار سکتا تھا۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ شخصی املاک کو صرف اُن اشیاء تک محدود کر دیا جائے جو کسی فرد کی ذاتی ضروریات ہوں اور ہر قسم کی پیداوار کو ذخیرہ کر کے اُسے شہریوں میں اُن کی ضرورت کے مطابق بانٹ دیا جائے۔ ہر صحت مند شخص سے کام لیا جائے اور بے کار طفیل خواروں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ موریلی کی اِس کتاب سے وہ اصول لیا گیا ہے جو بعد میں اِشتمالی انقلاب کا نعرہ بن گیا ـــــ "ہر ایک سے اُس کی قابلیت کے مطابق، ہر ایک کو اُس کی ضروریات کے مطابق۔"

دولباخ نے اپنی کتاب "عیسائیت کا کچا چٹھا" میں کلیسا اور ریاست کے اتحاد پر کڑی تنقید کی۔ اُس نے مذہب کو عوام کی افیون کہہ کر کارل مارکس کی پیش قیاسی کی۔ وہ کہتا ہے کہ حکّام عوام کے توہمات سے فائدہ اُٹھا کر اپنا اُلّو سیدھا کر رہے ہیں۔ مذہب عوام کو غیر مرئی قوتوں کا خوف

دِلاکر اُنہیں اُس جور و ستم کو خاموشی سے برداشت کرنے پر آمادہ کرلیتا ہے جو مربی قوانین اُن پر ڈھاتے ہیں۔ اُس نے ضمیر کو پولیس کا خوف کہہ کر فرائڈ کی پیش قیاسی کی۔ وہ کہتا ہے کہ "ہم دیکھتے ہیں کہ امیروں کو ضمیر کی خلش کبھی پریشان نہیں کرتی نہ اُنہیں اِس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اُنہوں نے عوام پر ظلم کرکے اپنی دولت اکٹھی کی ہے۔ دولباخ نے لاک اور کارل مارکس کی طرح کہا کہ محنت ہی تمام دولت کا ماخذ ہے۔

کارل مارکس کے پیش روؤں میں آدم سمتھ اور ریکارڈو نے بھی محنت ہی کو تمام دولت کا مصدر قرار دیا تھا۔ رابرٹ اوون نے صنعت کاروں اور مزدوروں کے تعلقات میں امداد باہمی کے اصول پر مفاہمت کرنے کی تلقین کی۔ سیں سائمن نے معاشرتی زندگی کے ارتقاء میں سائنس اور صنعت کاری کی اہمیت واضح کی۔ گویا اشتمالیت کے عناصر ترکیبی کسی نہ کسی صورت میں شروع سے موجود رہے ہیں۔ کارل مارکس کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اشتمالیت کے مثالی تصوّر کو حقیقی اور قابل عمل بنا دیا اور مارکسیت کی صورت میں ایک محکم منطقی نظام پیش کیا۔ اُس نے تاریخ اور معاشرے کے اِرتقاء کی مادی توجیہ کی اور طبقاتی کشمکش اور فاضل قدر جیسے معروضی قوانین دریافت کیے جس نے اُس کے نظریے کو سائنٹیفک بنا دیا۔ یاد رہے کہ اشتمالیت نظریہ بھی ہے اور عمل بھی ہے۔ اِس میں نظریّے کو عمل سے اور عمل کو نظریّے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ اِسی لیے مارکس نے کہا ہے کہ فلاسفہ کا کام کائنات کی تشریح کرنا ہی نہیں ہے بلکہ معاشرے کو بدل دینا بھی ہے۔

اِشراق

باطن کو نورِ حق سے روشن کرنا۔ افلاطون کی مثالیّت ایک عقلیاتی نظامِ فکر ہے لیکن اُس کے اِشراق پر فیثاغورس کے باطنی نظریّے کا اثر پڑتا ہے جو وجد و حال پر مبنی تھا۔ اُس کے اِشراقی افکار کو فلاطینوس نے از سرِ نو مرتّب کرکے نو اِشراقیت کا فلسفہ پیش کیا تھا۔ مسلمانوں میں شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول کا مسلک اِشراق ہی تھا۔ اُنہیں صلاح الدین ایوبی نے کفر و زندقہ کے الزام میں قتل کرا دیا۔

اَشیرا

مقدّس کھمبا جو مصر اور کنعان کے معبدوں کے صحن میں گاڑتے تھے۔ اشیرا لنگ کی علامت تھا۔

یہودی اپنے معبدوں میں صدیوں تک اُشیرات نصب کرتے رہے اور ان کی تقدیس کرتے رہے۔ گرجوں کے مینارے انہی سے یادگار ہیں۔

اِضافیت

جدید طبیعیات کا ایک اِنقلابی نظریہ جس نے زمان اور مکان کے بارے میں روائتی مفروضات بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ گلیلیو اور نیوٹن کے خیال میں زمان اور مکان ایک دوسرے سے علاحدہ مستقل صُورت میں موجود ہیں۔ نیوٹن کے معاصر لائب نٹز نے کہا کہ زمان اور مکان متغائر نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت اِضافی ہے۔ منکوسکی، لورنٹز اور آئن شٹائن کی تحقیق نے لائب نٹز کی تصدیق کی ہے۔ اُنہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ زمان مکان / زمان اِکائی کی چوتھی بُعد ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اب کوئی ایک آفاقی زمان نہیں رہا بلکہ وہ مکان / زمان اِکائی کی چوتھی بُعد بن گیا ہے۔ عالَم چار اَبعاد کی اِکائی ہے۔ مکان / زمان اِکائی کے تین اَبعاد مکانی ہیں اور چوتھی بُعد زمانی ہے۔ گویا اضافیت کی رُو سے زمان اور مکان ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہیں بلکہ باہم دگر اضافی طور پر موجود ہیں۔ اضافیت نے نیوٹن کے نظریہ کشش ثقل کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ آئن شٹائن نے اِضافیت کے چھوٹے نظریے میں ثابت کیا ہے کہ روشنی کی رفتار ـــــ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ـــــ سے زیادہ رفتار کسی شے کی نہیں ہو سکتی۔

اِعادۂ شباب

از سرِ نَو جوان ہونے کا شوق قدیم زمانے سے اِنسان کے دِل میں چٹکیاں لے رہا ہے۔ اِس مقصد کے لئے روما میں اکھاڑوں میں لڑ کر مرنے والے جوانوں کے زخموں سے اُبلتا ہوا خون پیا جاتا تھا۔ اُمراء کی عورتیں اپنے شباب کو بحال رکھنے کے لئے جوان لڑکیوں کے خُون میں نہاتی رہی ہیں ہنگری کی ایک شہزادی باتھوری اپنی جوان لونڈیوں کو ذبح کر کے اُن کے خُون میں نہایا کرتی تھی۔ بعض اقوام میں اِس مقصد کے لئے بُڈھے جوان عورتوں کا دُودھ پیا کرتے تھے۔ آیور ویدک میں کھوئی ہُوئی جوانی کو واپس لانے کے لئے کایا کلپ کا طریقہ رائج ہے یعنی بُڈھا ایک مدت تک اندر گھسا بیٹھا رہتا ہے اور خاص طریقے سے تیار کئے ہوئے کھانے اور مشروبات استعمال کرتا ہے۔ طب یُونانی میں یاقوتی ،

انوشدارو اور ماء اللحم موثر خیال کئے جاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے بعض نسخوں میں بکرے اور بیل کے آلات تناسل بھی ملا کر کھلائے جاتے ہیں۔ چین میں تانیثیت والے نوخیز کنواریوں کو خلوت میں بلا کر عمر رفتہ کو آواز دیا کرتے تھے۔ عہد نامۂ قدیم میں آیا ہے کہ حضرت داؤد بڈھے اور کہن سال ہوئے تو اُن کا نکاح ایک دوشیزہ شونمیت ابی شاگ سے کیا گیا تاکہ اُن کے بدن میں شباب کی حرارت دوبارہ رواں کی جا سکے۔ اس لڑکی کے نام پر جنسی نفسیات کی اصطلاح "شونمیت کا مسلک" وضع کی گئی جس کا مطلب ہے جوان لڑکیوں کو خلوت میں بلا کر اعادۂ شباب کرنا۔ حافظ شیرازی سے

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر صبحدم تاز کنارِ تو جواں برخیزم

کچھ عرصہ ہوا ڈاکٹر ورونوف نے بندر کے غدود لگا کر بوڑھوں کو جوان کرنے کے تجربات کئے تھے جو ناکام ثابت ہوئے۔ آج کل مغرب میں ماں اپنی بیٹی اور باپ اپنے بیٹے کا ہم عمر دکھائی دینے کے لئے مذبوحی حرکتیں کر رہے ہیں۔

اعداد

اعداد کا فلسفہ فیثا غورس سے یادگار ہے جو اعداد سے حساب لگا کر پیش گوئیاں کیا کرتا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ جفت اعداد شر کی علامتیں ہیں اور مونث ہیں جب کہ طاق اعداد خیر کی علامات ہیں اور مذکر ہیں۔ ۲ کا ہندسہ سب سے زیادہ شر آمیز ہے کیوں کہ یہ سب سے پہلے ایک سے علاحدہ ہوا تھا۔ ایک خدا کا عدد ہے جب کہ ۲ اُس کے دشمن شیطان کا عدد ہے۔ ۳ باپ، ماں اور بیٹے کی تثلیث کا نشان ہے۔ اوزیرس، آئسس اور ہورس کی تثلیث مصر قدیم میں موجود تھی جو بعد میں عیسائیوں نے اپنا لی۔ ۳ جنسی عدد ہے اور مرد کے آلات تناسل کی علامت ہے۔ یہی تکون عورت کی فرج کی علامت بھی ہے۔ ۴ کا ہندسہ مربع ہے جو زوج اور لونی کی علامت ہے: چاند کے چار مراحل، مہینے کے چار ہفتے، سال کے چار موسم، چار اطراف، چار کیفیات (گرم، سرد، مرطوب، خشک)، چار اخلاط (دم، بلغم، صفرا، سودا)، بہشت کے چار دریا، چار بڑے فرشتے۔ ۵ کا عدد نظر بد اور آفات سے محفوظ رکھتا ہے۔ پرانے زمانے میں انسان کے پنجے کا نشان مقدس سمجھا جاتا تھا۔ مغلوں کے ہاں خاص فرامین پر بادشاہ اپنے ہاتھ کا پنجہ خون یا صندل میں ڈبو کر لگاتے تھے۔ پنج تن، پنج پیر میں اس کا تقدس کار فرما ہے۔ عرب اور ایرانی اپنے قالینوں

میں پانچ پانچ پتیوں کے پھول کاڑھتے ہیں تاکہ وہ نظرِ بد سے محفوظ رہیں۔ تعویذوں میں عموماً پانچ خانے رکھے جاتے ہیں۔ سکھوں کے پنج پیارے، پانچ ککّے، جشن ابدال میں گورو صاحب کے پنجے کا نشان بھی قابلِ غور ہیں۔ ۶ کا عدد جفت ہے، عورت کی محبت اور گرہست کی علامت ہے۔ فیثا غورسیوں کے یہاں ۷ کا عدد نہایت مقدّس تھا۔ وہ اسے سات سیارّوں کی علامت مانتے تھے۔ ہفتے کے سات دنوں کے نام بابل والوں نے سات سیارّوں کے نام پر رکھے تھے۔ یہی حال ہندوؤں کا تھا: اتوار (آدت یعنی سورج کا دن) سوم وار (چاند کا دن) منگل (مریخ کا دن) بُدھ (عطارد کا دن) ویروار (برہس پتی یا مشتری کا دن) شُکر (زُہرہ دیوی کا دن) سنیچر (زُحل کا دن)، سپتک کے سات سُر (کھرج، رکھب، گاندھار، مدھیم، پنچم، دھیوت، نکھاد)، یہودیوں کے مُقدّس شمع دان کی سات شاخیں، بنات النعش کے سات ستارے، سات جزیرے، اسماعیلیوں کے سات امام اس عدد کے تقدّس کی شہادت دیتے ہیں۔ ہپوقریطیس (بقراط) کہتا ہے کہ اپنی طلسماتی قوّت کے باعث یہ عدد تمام اُمور کی تکمیل کا باعث ہوتا ہے، حیات بخش ہے اور تمام موجودات کو متاثر کرتا ہے۔ ۷ کی طرح ۱۲ کے عدد کو بھی بارہ بُرجوں کی رعایت سے مُتبرّک مانتے تھے۔ یہودیوں کے بارہ قبائل، عیسائیوں کے بارہ اولیاء، اثنا عشریوں کے بارہ امام۔ ۴۰ کے عدد کو بھی سِرّیت اور عرفان میں اہمیت دی جاتی تھی۔ صُوفی اور ملنگ چالیس دن کا چلّہ کاٹ کر جنّوں کو اپنے قابو میں لاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے چالیس دن کوہِ سینا پر کاٹے تھے۔ مُردے کی آخری رسوم چہلم پر ختم ہوتی ہیں۔ ہندوؤں کی جوتش میں ۵۲ اور ۸۴ کے اعداد بھی سعد ہیں۔ ۵۲ پیر، چوراسی سِدھ، چوراسی لاکھ جنم۔ سب سے منحوس اور نامبارک عدد ۱۳ کا ہے جسے شیطانی عدد کہا جاتا ہے۔ جناب عیسیٰ کو اُن کے ۱۳ ویں حواری یہودا اسکریوطی نے گرفتار کروایا تھا۔ ایرانی گنتی کر رہے ہوں تو ۱۳ کا عدد مُنہ سے نہیں نکالتے۔ دوازدہ کے بعد زیاد کہہ کر ۱۴ پر چلے جاتے ہیں۔ آج کل یورپ میں یہ توہّم عام ہے کہ کسی مجلس یا دعوت میں ۱۳ ویں کرسی پر بیٹھنے والا شخص چند روز کے بعد مر جاتا ہے۔

آفتاب

آفتاب کو انسان قدیم زمانے سے اپنا مہربان باپ اور سچّا دوست سمجھتا رہا ہے کیوں کہ وہ اُسے

رات کی بھیانک تاریکیوں سے نجات دلاتا ہے چنانچہ اقوامِ عالم نے اپنی دیومالا میں اُسے خداوند خدا بنالیا جو حیات بخش ہے، پروردگار ہے۔ سُمیریا کا شمش، بابل کا بعل، کارتیج کا مولک، شام کا مردوک، فلسطینیوں کا ایل، مصریوں کا رع اور ہورس، یونانیوں کا اپالو، میکسیکو کا ہوئی ٹولوپکٹلی، ایرانیوں کا مِتھرا، ہندوؤں کا مِترا، آدت، سُوتر، دوسوت، وشنو سب آفتاب دیوتا ہی تھے۔ ان کے بھجنوں میں آفتاب کو زندہ و پائندہ، خیر بخش اور نیرِ اعظم کہا گیا ہے۔ ویدوں میں اس کے القاب ہیں دِنکر (دن کو لانے والا) بھاسکر (روشنی کا خالق) گرہ پتی (ستاروں کا آقا) کرم ساکھشی (انسان کے اعمال کا مشاہدہ کرنے والا) وغیرہ۔

آفتاب دانش، صداقت، روشنی اور نیکی کی علامت بن گیا تھا۔ ہندوؤں کے مقدس ترین منتر گایتری میں آفتاب ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔

"آؤ ہم یزدانی حیات بخش آفتاب کے عظیم جلال پر تعمق کریں وہ ہمارے فہم کو روشن کرے"

غاروں کے انسان کو بخوبی معلوم تھا کہ اُس کی زندگی کا انحصار آفتاب پر ہے اس لئے جب شام کو سُورج غروب ہو جاتا تو اس کے دل میں ہَول اُٹھتا کہ اگر وہ واپس نہ آیا تو کیا ہو گا۔ جاڑے میں جب آفتاب جنوب کی طرف سرکنے لگتا تو وہ دہل جاتا کہ کہیں وہ غائب ہی نہ ہو جائے۔ چنانچہ آفتاب کو فنا سے بچانے، لوٹانے اور اُس کی روشنی کو بحال رکھنے کے لئے رسُومِ عبادت ادا کی جاتی تھیں اور کسی انسان کی یا جانور کی قربانی دی جاتی تھی۔ قدیم انسان خُون کو زندگی اور حرارت کی علامت سمجھتا تھا اس لئے خیال یہ تھا کہ قربان گاہوں پر بہائے جانے والے خُون سے آفتاب کی روشنی اور حرارت کو تقویت بہم پہنچے گی۔ معبدوں کے دروازے مشرق کی طرف رکھے جاتے تھے تاکہ سُورج کی پہلی شعاعیں دیوتاؤں پر پڑیں۔ ہندوؤں کے ہاں آج بھی مندروں کے دروازے مشرق ہی کی جانب رکھے جاتے ہیں۔ صابئیت یا سیارہ پرستی دُنیا کا قدیم ترین منظّم مذہب ہے۔ اس میں سات سیاروں کی پُوجا کی جاتی تھی۔ آفتاب کو ان سب کا سردار مانتے تھے اور نیرِ اعظم کہتے تھے۔ پروہت صبح، دوپہر اور شام کو آفتاب کے نام جپتے تھے اور سوریہ نمسکار کرتے تھے۔ ایران میں آفتاب کے پجاریوں کو شمسیہ کہا جاتا تھا۔ آگ کی تقدیس بھی اُسے آفتاب کی علامت سمجھ کر کی جاتی تھی۔ اکبر کا دینِ الٰہی شمسیہ مذہب ہی کی ایک شاخ تھا۔ اُس نے مجوسی علماء اردشیر اور

آزر پیران کو ایران سے بلوایا اور آفتاب کی پرستش کے طریقے اُن سے سیکھے۔ اِسی طرح ہندوؤں سے اُس نے آفتاب کے ایک ہزار نام سیکھے جو ہر روز وہ جپتا تھا۔ ایک جین عالم بھان چندر اپادھیائے نے اُس کے لئے ایک کتاب سُوریہ سہاسترا لکھی جس میں سُوریہ پُوجا کے طریقے درج تھے۔ مُلا شیری نے اِسی انداز میں مثنوی ہزار شعاع تصنیف کی۔

بابل، عراق اور ایران کے صابئین نے آفتاب کی گردش کو برقرار رکھنے کے لئے عبادت کی رسمیں وضع کیں۔ بابل کے صابئین دن رات میں سات نمازیں پڑھتے تھے جن کے اوقات آفتاب کی مختلف منازل سے وابستہ تھے۔ طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے جب مشرق کی جانب اُجالے کی مدہم لکیر پھیل جاتی صابئین کے معبدوں میں گھڑیال بجائے جاتے اور پروہت نماز پڑھتے جس میں رکوع و سجود کرتے تھے۔ اِس میں جو بھجن پڑھے جاتے اُن میں آفتاب کی ستائش کی جاتی تھی۔ طلوعِ آفتاب پر شُکرانے کی نماز پڑھتے تھے اور آفتاب کے سامنے سجدے میں گر پڑتے تھے۔ تیسری اور چوتھی نماز آفتاب کے زوال کے اوقات میں ادا کی جاتی تھی جس میں اِس تشویش کا اظہار مقصود تھا کہ آفتاب مغرب میں ڈوب جائے گا۔ غروبِ آفتاب اور آدھی رات کی نمازیں آفتاب کے ظہور کی دعاؤں پر مشتمل ہوتی تھیں آخری نماز آدھی رات گذر جانے کے بعد ادا کرتے تھے اور اِس میں دُعا مانگتے تھے کہ آفتاب تاریکی کے عفریت کے چنگل سے آزاد ہو کر دوبارہ طلوع ہو۔ سورج گرہن اور چاند گرہن کی نمازیں بھی پڑھتے تھے۔ یہودیوں کی کتاب تالمود میں صُبح، دوپہر اور شام تین نمازوں کا حکم دیا گیا ہے۔ مجوسی پانچ نمازیں پڑھتے ہیں اور انہیں پنجگاہ (گاہ یعنی وقتِ نماز) کہتے ہیں۔ اِن نمازوں میں گاتھا سے آفتاب دیوتا مِتھرا کی حیاتِ جاوید کے لئے بھجن پڑھتے ہیں۔ مِتھرا کی دُعا کو نیائش اور آفتاب کی دعا کو ستائش کہتے ہیں۔ ان دعاؤں کے پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ آفتاب کی روشنی اور حرارت برقرار رہے۔ لفظ نماز پہلوی زبان سے لیا گیا ہے۔ فارسی میں نماز کو گاہ کہتے ہیں۔

سواستکا (卐) جو قدیم آریائی نشان ہے سورج ہی کی علامت ہے کلیسیائے رُوم میں بھی آفتاب پرستی کے کئی شعائر باقی ہیں مثلاً راہب اپنے سر کے بال منڈوا کر جو چاند سی بناتے ہیں وہ

قرصِ آفتاب کی علامت ہے۔ تصویروں میں جناب عیسیٰ اور اولیاء کے سروں کے گرد جو ہالہ دکھاتے ہیں وہ بھی اسی نوع کی ایک علامت ہے۔

افرودائتی

یونانی دیومالا کی حسن و عشق کی دیوی جو زمین، دوزِ عالم کے دیوتا ہیفے سٹس کی زوجہ تھی لیکن دوسرے دیوتاؤں اور انسانوں سے بھی معاشقے کرتی تھی عشق کا دیوتا کیوپڈ اسی کا بیٹا تھا جو اپنے بے پناہ تیروں سے اکثر اپنی ماں کو بھی مجروح کر دیتا تھا۔ اس روایت میں یہ حقیقت مرموز ہے کہ عشق حسن ہی کا زائیدہ ہے، جہاں حسن نہ ہو وہاں عشق بھی نہیں ہوگا۔ افرودائتی جزیرہ قرص کے ساحل سمندر سے جھاگ میں سے نمودار ہوئی تھی اس لئے اسے سپرین بھی کہتے ہیں۔ افرو یونانی زبان میں جھاگ کو کہتے ہیں چنانچہ اس کے نام کا مطلب ہے" جھاگ کی بیٹی" کسبیوں کی سرپرست دیوی ہے، اس کے معبد میں جنسی ملاپ کی عام اجازت تھی۔ ہنس، چڑیا، فاختہ، سرو، گلاب اور سیب اس کے علامتی پرندے اور پودے ہیں۔ اسی کے نام پر مقوی اور ممسک دواؤں کو افرو ڈیسیک کہا جاتا ہے۔

اقدارِ اعلےٰ

جس بات یا شے میں ہم دلچسپی لیں اُس میں ہمارے لئے قدر پیدا ہو جاتی ہے۔ اعلےٰ قدریں بقول افلاطون تین ہیں: صداقت، خیر، حسن۔ سائنس دان اور فلاسفہ صداقت کی، مصلحین اخلاق خیر کی اور فن کار حسن کی ترجمانی کرتے ہیں۔

آکاش

عنصر جو ہندو ویدوانوں کے خیال میں فضا کے خلا میں بھرا ہوا ہے۔

اکھاڑا

(۱) ناچ گانے کی مجلس۔ اندر دیوتا کا اکھاڑا جس میں گندھروں کے سازوں کی گت پر اپسرائیں بھاؤ بتا بتا کر ناچتی ہیں۔ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتا ہے کہ اُمراء اور روساء کے محلوں میں تفریح طبع کے لئے راتوں کو اکھاڑا برپا ہوتا ہے جس میں اُن کی لونڈیاں اور پاتریں ہی حصّہ لیتی ہیں۔ اُنہیں گانے بجانے اور

ناچ کی تعلیم دلائی جاتی ہے۔ چار حسین عورتیں ناچ کی پیش وائی کرتی ہیں اور چار گانا شروع کرتی ہیں۔ دو دو عورتیں پکھاوج اور اُپنگ بجاتی ہیں جب کہ ایک ایک رباب، وین اور جنتر کو چھیڑتی ہے۔ اس موقعے پر فانوس روشن کیے جاتے ہیں۔ دو عورتیں ناچنے والیوں کے قریب کنول روشن کرکے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ بعض اکھاڑوں میں زیادہ عورتیں حصّہ لیتی ہیں۔ نوخیز لونڈیوں کو ناچ گانا سکھانے کے لیئے نٹ ملازم رکھے جاتے ہیں۔ کبھی کبھار یہ لوگ خود اپنی لڑکیوں کو ناچ گانے کی تربیت دے کر روساء کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

(۲) جہاں لوگ مل بیٹھ کر افیم، چرس وغیرہ کا نشہ کرتے ہیں، سندھ میں اسے دائرہ کہتے ہیں۔ پنجاب میں اکھاڑا پہلوانی کے ساتھ مخصوص ہے۔ شام کو پہلوان اکھاڑے میں زور آزمائی اور ورزش کرتے ہیں۔

اکیڈیمی

ایتھنز کے نواح میں ایک پُر فضا باغ تھا جس میں افلاطون فلسفے کا درس دیا کرتا تھا۔ آج کل یہ لفظ علماء کی جماعت کے لیئے مخصوص ہے۔

آگ

اِنسان دورِ وحشت میں آگ کی پوجا کیا کرتا تھا کیونکہ وہ اُسے جاڑے کی ٹھر سے محفوظ رکھتی تھی اور درندے بھی آگ کے الاؤ کے قریب نہیں پھٹکتے تھے۔ رفتہ رفتہ آگ پر گوشت بھوننے کا رواج ہو گیا۔ پہلے پہل آگ آسمانی بجلی گرنے سے حاصل کی جاتی تھی پھر پتھر اور لکڑی کے ٹکڑوں کو آپس میں رگڑ کر آگ روشن کرنے لگے۔ آگ ہی سے دھاتوں کے زمانے کا آغاز ہوا اور صنعت وحرفت کی داغ بیل ڈالی گئی۔ قدیم اِنسان آگ کو اپنا مہربان دوست سمجھ کر اُس کی تقدیس کرتا تھا اور اُس پر سوختنی قُربانیاں دیا کرتا تھا۔ کھیتی کی پہلی بالیں اور بھیڑوں بکریوں کے پہلوٹھی کے بچے اُس کی بھینٹ کئے جاتے تھے۔ ہندوؤں کا ہوم اِسی سے یادگار ہے جس میں گھی، چاول اور خوشبودار لکڑیاں آگ میں پھینک کر بھجن پڑھتے ہیں۔ مجوسی یا گبر آگ کو آفتاب کی علامت اور مظہرِ یزدانی سمجھ کر اِسے مُقدّس مانتے ہیں۔ اُن کے آتشکدوں میں آگ کبھی بجھنے نہیں پاتی۔ وہ دن میں تین بار اِس میں خوشبودار لکڑیاں ڈال کر گاتھا سے زمزمہ کرتے ہیں۔ یہی اُن کی نمازیں ہیں۔ یہودیوں نے سوختنی قُربانیاں دینے کی رسم کنعانیوں سے لی تھی۔ کنعانیوں اور کارتھیج والوں کے دیوتا مولک (یہ لفظ عربی

میں ملک بمعنی بادشاہ یا آقا بن گیا) کے برنجی بُت کے سامنے ہمہ وقت آگ جلتی رہتی تھی اور اُس کے شکم میں شعلے بھڑکتے رہتے تھے۔ قومی مصیبت کے وقت اُمراء اپنے ننھے مُنے بچے اِس کی آگ میں پھینک کر نجات طلب کیا کرتے تھے۔ اُن کی چیخوں کو دبانے کے لئے زور زور سے دمدمے پیٹے جاتے تھے اور نفیریاں بجائی جاتی تھیں۔ مائیں اپنے جگر گوشوں کو آگ میں بھسم ہوتے دیکھ کر حرفِ شکایت زبان پر نہیں لا سکتی تھیں نہ اُنہیں آنسو بہانے کی اجازت تھی۔ اکثر مذاہب میں آگ کے سامنے عہد و پیمان کئے جاتے تھے۔ آج بھی ہندوؤں کے یہاں دُلہا اور دُلہن آگ کے گرد سات پھیرے لیتے ہیں۔ اقوامِ عالم کی دیومالا میں آگ کو دیوتا مانا گیا ہے۔ رِگ وید میں اگنی آگ ہی کا دیوتا ہے۔ یُونانی دیومالا کی ایک کہانی میں بتایا گیا ہے کہ پرومیتھس دیوتاؤں کے مسکن سے انسان کے لئے آگ چرا کر لایا تھا جس کی پاداش میں خُداوند خدا زیوس نے اُسے کوہ قاف کی ایک چٹان سے جکڑ دیا۔ ایک گِدھ ہر روز اُس کا کلیجا نوچا کرتا تھا۔ اِس موضوع پر یُونان کے المیّہ نگار اسکیلس کی تمثیل مشہور ہے جس میں پرومیتھس کو ایک بطلِ جلیل کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے جو انسانوں کی بہبود کے لئے دیوتاؤں کا ستم برداشت کرتا ہے۔ وہ مردانہ وار عذاب جھیلتا ہے اور خداوند خدا زیس کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔

اِلحاد

اِس لفظ کے لغوی معنی ہیں جھگڑا کرنا، ملحد جھگڑالو ہوا۔ فلسفے کی اصطلاح میں جو شخص حیات بعد موت یا بقائے رُوح کا منکر ہو اُسے مُلحد کہتے ہیں۔ بقائے رُوح مذہب کا سنگِ بنیاد ہے لہٰذا اِس سے انکار گویا مذہب سے انکار ہے۔ اِسلامی تاریخ میں اسحٰق الراوندی، عمر خیّام اور ابوالعلا معرّی مشہور ملاحدہ ہو گزرے ہیں۔

اُلجھنیں

تحلیلی نفسیات کی اِصطلاح میں شعُور کے وہ ٹکڑے جو کسی شخص کی اذیت ناک ذہنی کشمکش کے باعث اپنی اصل سے منقطع ہو کر لاشعور میں چلے جائیں اور وہاں سے بھیس بدل بدل کر شعُور پر اثر انداز ہوتے رہیں، اُلجھنیں کہلاتے ہیں۔ اُلجھن کی ترکیب ژُنگ نے وضع کی تھی اور اس کی محوّلہ بالا تعریف بھی اُسی کی ہے۔ اُلجھنیں بعض حالات میں خللِ ذہن کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔ جب کوئی ماہرِ نفسیات

تجزیۂ نفس سے کسی اُلجھن کی نشاندہی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ اُلجھن غائب ہو جاتی ہے اور اِس کے سلبی اثرات بھی زائل ہو جاتے ہیں۔

اللّٰہ

اَل اِلٰہ کا مُرکّب ہے۔ اِس کا معنیٰ ہے معبود۔ یہ لفظ اِسلام سے پہلے کے عرب شُعراء کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ کنعانی معبود کو اِل کہتے تھے۔ شامی اور عبرانی میں اِسے اِیل اور ایلوہم (جمع ایلوا) کا نام دیا گیا۔ عربی میں اللّٰہ کہا گیا۔ اللاّت اِس کی مونث ہے جس کا معنیٰ ہے ربّہ۔ جبرآئیل، اِسرافیل وغیرہ ناموں میں اِیل بہ معنیٰ خداوندی آیا ہے۔

اَلمُوت

اس کا لغوی معنیٰ ہے "آشیانۂ عقاب"۔ یہ قزوین اور گیلان کے درمیان پہاڑ کی چوٹی پر حشیشین کا مضبوط قلعہ تھا جو حسن بن صبّاح نے تعمیر کرایا تھا اور جس میں اُس نے جنّت بسائی تھی۔ رُکن الدین خورشاہ کے عہدِ حکومت میں ہلاکو خان نے اِسے فتح کر کے برباد کر دیا۔

اَلمیّہ

اَلمیّہ کا آغاز یُونانی تمثیل سے ہوا۔ اسکیلس، سوفوکلیز اور یوری پیڈیز کو دُنیا کے عظیم اَلمیّہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسکیلس کا پرومیتھیس، سوفوکلیز کا ایڈیپس ریکس اور یوری پیڈیز کا ٹروجن عورتیں مشہور المیّے ہیں۔ المیّہ یا ٹریجیڈی کی ابتداء اُن گیتوں سے ہوئی تھی جو بکیس کے پُجاری اُس کے تہوار پر گاتے تھے۔ یُونانی المیّے کی نمایاں خصوصیّت یہ ہے کہ اِس میں کسی بطلِ جلیل کی آویزش تقدیر (یُونانی اِسے موئیرا کہتے تھے) سے دکھائی جاتی ہے۔ اُسے اپنے المناک انجام کا عِلم ہوتا ہے لیکن وہ تقدیر کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا بلکہ مردانہ وار جدّ وجہد کرتا ہوا موت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اُس کی دلیرانہ کشمکش اور المناک موت سے ناظرین کے دِلوں میں بقول ارسطو رحم اور خوف کے جذبات اُبھرتے ہیں جس سے اُن کے ذہن و قلب کی تنقیح ہو جاتی ہے۔ یُونانی المیّے کا ہیرو بسا اوقات کوئی بادشاہ یا سردار ہوتا تھا۔ یُونانیوں کے بعد رومہ کے تمثیل نگاروں نے بھی المیّے لکھے لیکن وہ یُونانی المیّے کی بلندیوں تک نہ پہنچ

سکے۔ احیاء العلوم کے دور میں فرانس میں ریسین اور کورنیل اور برطانیہ میں شیکسپیئر نے عظیم المیے لکھے۔ ریسین کی فیدرے کو آدم سمتھ نے دنیا بھر کا عظیم ترین المیہ کہا ہے۔ شیکسپیئر کے المیے میکبتھ، ہیملٹ، کنگ لیئر، رومیو جولیٹ اور اوتھیلو نفسیاتی کشمکش پر مبنی ہیں۔ ان میں انسان کی آویزش مقدر کے علاوہ دوسرے انسانوں کے خلاف بھی دکھائی گئی ہے۔ جدید دور کے المیے میں انسان کی اپنی ذات کے ساتھ آویزش کا موضوع نمود پذیر ہوا ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثالیں اِبسن کی تمثیلیں ہیں۔ بہر صورت خارجی اور داخلی جبر کا شعور اور اس سے نجات پانے کی مردانہ وار مگر ناکام کوشش ہی المیے کا موضوع رہا ہے۔ ارسطو کے بعد نیٹشے کو المیے کا سب سے بڑا نقاد سمجھا جاتا ہے۔

اَمرد

مرد آ سے ہے جس کا معنیٰ ہے وہ چٹیل میدان جہاں سبزے کا نام و نشان نہ ہو۔ اَمرد سادہ عذار نوجوان کو کہتے ہیں جس کی مَس نہ بھیگی ہو۔ مردوں کی ہم جنسی محبت کو اَمرد پرستی کہا جاتا ہے۔ فارسی اور اردو کی کلاسیکی غزل میں اَمردوں ہی سے اظہارِ عشق کیا گیا ہے۔

اَنا

شعورِ ذات یا شعور کے شعور کو تحلیلی نفسیات کی اصطلاح میں اَنا یا ایغو کہتے ہیں۔ حیوانات میں شعور ہوتا ہے لیکن اس شعور کا شعور نہیں ہوتا۔ ایک کتا ہڈی کو دیکھ کر اُس کی طرف لپکتا ہے۔ وہ اس بات کا شعور رکھتا ہے کہ یہ کھانے کی چیز ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ "میں ہڈی کو دیکھ رہا ہوں" جب کہ انسان ہڈی کو دیکھ کر جان لیتا ہے کہ یہ ہڈی ہے اور "میں جانتا ہوں کہ میں اسے جانتا ہوں"۔ اَنا کے تین پہلو ہیں (۱)۔ بحیثیت عالم کے (۲)۔ بحیثیت متفکر کے اور (۳)۔ بحیثیت حَکَم کے۔ اَنا کی تین قسمیں ہیں (۱)۔ نرگسی یا واضح اور جارحانہ انانیت (۲)۔ اپنی ذات کو گرانے والی (۳)۔ متوازن۔

اَنتریامی

ہندو سریانی خدا کو جو کائنات میں جاری و طاری ہے اَنتریامی کہتے ہیں۔

اِنتقاد

نقد سے مشتق ہے۔ اصطلاح میں اس کا مطلب ہے کسی فن پارے یا ادبی

تحریر میں جمالیاتی قدر کا تعین کرنا۔ انتقاد کی کئی قسمیں ہیں مثلاً تاثراتی، سائنٹفک وغیرہ۔ ارسطو، لان جائنس، ڈرائڈن، کولرج، سانت بو، بیلنسکی، ٹی۔ایس ایلیٹ وغیرہ نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے انتقاد کے اصول وضع کئے ہیں لیکن نقدِ ادب محض اِن اصولوں کے اطلاق کا نام نہیں ہے بلکہ اِس میں شاعر اور مصنّف کی شخصیت اور اُس کے ماحول کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ ژنگ کہتا ہے کہ مصنّف یا شاعر کی ذات غیر اہم ہے اصل بات تو یہ ہے کہ کسی نظم یا ادب پارے کی اپنی حدود میں رہ کر اُس پر محاکمہ کیا جائے۔ بہر صورت نقّاد کے لئے خود بھی جمالیاتی احساس، تخلیقی صلاحیت اور حُسنِ ذوق سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے کہ اس کے بغیر وہ شاعر کی تخلیقی قوّت کا اندازہ لگانے سے قاصر رہے گا۔ فن کار انسان کے منتشر ذہنی و قلبی واردات و کیفیات میں معنویّت اور ربط پیدا کرتا ہے اور حُسن و جمال کی بے بقائی اور گریزپائی کو اپنے معجز نما اسالیبِ فن سے غیر فانی سانچے میں ڈھال دیتا ہے لہٰذا کسی فن کار کی ذہن کا تجزیہ کرتے وقت یہ دیکھنا مناسب ہوگا کہ وہ کس حد تک یہ شرائط پوری کرتا ہے۔ ناقدینِ ادب کا فریضہ اہم ہے۔ وہ نہ صرف عطائیوں کے زعمِ بے جا کا بُلبلہ پھوڑ دیتے ہیں بلکہ جواہرِ قابل کی جلا بھی کرتے ہیں۔ کاونٹ لیو ٹالسٹائے اور اشتراکی ناقدینِ ادب نے انتقاد کے روایتی معیار بدل کر رکھ دیئے ہیں۔ ٹالسٹائے کے ہاں جمالیاتی قدر کا معیار یہ ہے کہ کوئی فن پارہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو متاثر کرتا ہے کہ نہیں۔ اُس کے خیال میں جمالیاتی قدر کسی نظم، تصویر یا نغمے میں نہیں ہوتی بلکہ سامعین اور ناظرین اُس میں جمالیاتی قدر پیدا کرتے ہیں مثلاً روسی عوام کے لوک گیت شیکسپیئر کے المیے ہیملٹ سے زیادہ جمالیاتی قدر رکھتے ہیں کیوں کہ اُن کا حلقہ اثر ہیملٹ سے زیادہ وسیع ہے۔ اشتراکی ناقدین نے لیو ٹالسٹائے سے اتفاق کیا ہے البتّہ اُن کے خیال میں انسان دوستی، صداقت اور حُسن کے عناصر عظیم فن و ادب کی اساس بنتے ہیں۔ انہی عناصر نے اسکیلس، ارسٹوفینیس، شیکسپیئر، مولیئر، سروانٹز، گوئٹے، بالزک، اِبسن، ٹامس مان وغیرہ کو عظمت بخشی ہے۔ اشتراکی ناقدین کے یہاں فی زمانہ انسان دوستی کا تصوّر انقلابی اور فعّال ہو کر اُبھرا ہے۔ وہ جدید دور کے مغربی اہلِ قلم کی داخلیت اور موضوعیّت کو زوال پذیر اور مریضانہ قرار

دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اِنسان دوستی کا زبانی کلامی ذکر کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اِستحصال کے خاتمے کے لئے عملی جدّوجہد کرنا سچّی اِنسان دوستی ہے۔ لہٰذا سچّا فن کار، شاعر اور ادیب وہی ہے جو اِس جدّوجہد میں عملاً حصّہ لے رہا ہو اور عوام کی اِنقلابی اُمنگوں کی آبیاری کر رہا ہو۔

اناہِتا

اِیران قدیم کی دریا اور بار آوری کی دیوی جسے فارسی میں ناہید کہا گیا ہے۔ اِس کا تعلق بار آوری کے مَت سے تھا اور اِس کے معبد میں دیوداسیاں زائرین سے جنسی اِختلاط کرتی تھیں تاکہ فصلیں بافراط پیدا ہوں۔

انڈا

پُرانے زمانے میں انڈے کو حیات بعد موت اور خوش بختی کی علامت سمجھتے تھے۔ آج کل بھی عیسائی ایسٹر کے تہوار پر رنگے ہوئے انڈے ایک دوسرے کو بھیجتے ہیں تاکہ اگلے ایسٹر تک خوش و خُرّم اور زندہ رہیں۔

اننّاس

مشہور پھل ہے: اَن، اناج، کھاجا؛ آس: دیوتا مطلب ہوا دیوتاؤں کا کھاجا۔

اَن دیو

راجپوتوں کا اناج کا دیوتا۔

اُونسیاں پانا

زمین پر لکیریں کھینچ کر دو دو لکیریں مٹائی جاتی ہیں اگر ایک لکیر بچ رہے تو نیک فال سمجھی جاتی ہے۔

انگ ساک

دکن کے سیما قبائلی اپنے ماں باپ کے قریبی رشتہ داروں کو انگا کہتے ہیں۔ ہمارے دیہات میں اُنہیں انگ ساک کہا جاتا ہے۔

آواگَوَن

لغوی معنیٰ ہے آنا جانا۔ اِسے سنسار چکر بھی کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے اِس عقیدے کا

کہ رُوح موت کے بعد بار بار نیا قالب اختیار کرتی ہے رِگ وید میں کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔ شت پتھ برہمن میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ رِگ وید میں اتنا لکھا ہے کہ مرنے کے بعد آدمی کی رُوح پانیوں میں چلی جاتی ہے۔ یہ تصوّر دراوڑوں سے ماخوذ ہے جن کا عقیدہ تھا کہ موت کے بعد ارواح پرندوں یا درختوں میں چلی جاتی ہیں۔ آریا نے اِس پر جزا سزا کا پیوند لگایا اور کہا کہ ارواح اپنے نیک یا بد اعمال کے سبب نیا قالب لیتی ہیں اور اِنسان اپنے کرم کا پھل بہر صُورت بھوگتا ہے۔ آواگون ہندومت کا بُنیادی عقیدہ ہے۔ جو شخص آواگون کا قائل ہے وہ ہندو ہے خواہ وہ خُدا اور ویدوں کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔ اِسی بنا پر گوتم بُدھ اور مہاویر کو ہندو کہا جاتا ہے اگرچہ وہ خدا اور ویدوں کو نہیں مانتے۔

اوتار

سنسکرت میں اِس کا معنیٰ ہے 'نیچے آنا'۔ ہندوؤں کے عقیدے کے بموجب جب زمین ظلم اور گناہوں سے بھر جاتی ہے تو وشنو بھگوان کسی نہ کسی صورت میں اوتار لیتے ہیں اور ظلم اور بدینی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ رام اور کرشن اِسی نوع کے اوتار تھے۔ آخری اوتار کلکی ہو گا جو کلجگ کی برائیوں کا خاتمہ کر دے گا۔

اولیاء

صُوفیہ کے خیال میں قُطب یا غوث کا درجہ سب سے بلند ہے۔ اُس کا تصرّف ساری کائنات پر محکم ہوتا ہے گویا وہ کائنات کا محور ہے۔ قُطب کے بعد چار اوتاد ہیں۔ اِن کے بعد سات اخیار، پھر چالیس ابدال (انہیں چہل تن بھی کہا جاتا ہے) پھر ستر نجباء اور آخر میں تین سو نُقباء ہیں۔ شیخ احمد سرہندی کے خُلفاء قیّوم کہلاتے تھے یعنی کائنات اُنہی کے وجود سے قائم ہے۔ قیّوم قُطب ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

اوم

ہندوؤں کا مُقدّس ترین کلمہ۔ مونیر ولیمز کے خیال میں یہ کلمہ تین دیوتاؤں اگنی، وائیو اور مترا (سُورج) کے ناموں کے پہلے حروف سے مُرکّب ہے۔

اہورا مزدا

مجوسیوں کا خداوند خدا جو خیر، روشنی اور صداقت کا مبدء ہے۔ اس کا لُغوی معنیٰ ہے "خدائے خیر"

پروں والا سرانس کی تصویری علامت تھی۔

اہرمن

اہرمن یا انگرامینو (فرد خبیث) اہورامزدا کا توام تھا۔ شر، جہالت اور تاریکی کا نمائندہ ہے جو اہورامزدا کا ازلی و ابدی دشمن ہے۔ دونوں زروان (زمان) کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ثنویت اور کشمکش مجوسی مذہب کا اصل اصول ہے۔

اہرام مصر

فراعین مصر کے شاندار مقبرے جو انہوں نے اپنی میت اور دولت کو محفوظ کرنے کے لئے بنوائے تھے۔ غزہ کے تین اہرام سب سے بڑے ہیں۔ ان میں عظیم ترین فرعون خوفو کا ہے جو چار سو پچاس فٹ اونچا ہے اور جس میں ۲۳ لاکھ ۸۳ ہزار ٹن وزن کی سلیں لگائی گئی ہیں۔ فراعین کا خیال تھا کہ جب وہ دوبارہ جی اٹھیں گے تو یہ دولت ان کے کام آئے گی لیکن گذشتہ صدیوں میں چوروں نے ان کا سونے چاندی کا بیشتر سامان چرا لیا ہے اور صرف توت عنخ آمن کا سازوسامان ہی محفوظ صورت میں دستیاب ہو سکا ہے۔

آئسس

مصر قدیم کی چاند کی دیوی جو بعد میں بارآوری اور حیات کی دیوی بن گئی۔ اوزیرس کی زوجہ تھی جو زیر زمین دور مملکت کا دیوتا تھا اور مردوں کے اعمال کا حساب لیتا تھا۔ ان کا بیٹا ہورس آفتاب دیوتا تھا۔ ان کی تثلیث کئی مجسموں میں دکھائی دیتی ہے جن میں ننھے ہورس کو اپنی ماں کی گود میں بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ابتدائی دور کے عیسائی ان کے مجسموں پر مریم عذرا اور ننھے مسیح کا گمان کر کے ان کے آگے سجدہ کرتے تھے۔ اہل تحقیق کے خیال میں مریم پوجا آئسس ہی کی پوجا سے یادگار ہے۔ مصری دیومالا کی ایک روایت کے مطابق اوزیرس کے دشمن دیوتا سیت نے اسے قتل کر کے ٹکڑے ٹکڑے کیا اور انہیں دور دور پھینک دیا۔ آئسس نے دوڑ دھوپ کر کے ان ٹکڑوں کو جمع کیا اور اوزیرس کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ اس طرح وہ حیات کی دیوی بن گئی۔ آئسس کا مت تیسری صدی قبل مسیح میں یونان میں پھیل گیا۔ روما میں سلا نے اسے رواج دیا تھا۔

ایٹم

قدمائے یونان میں دیمقراطیس نے کہا کہ دُنیا ایٹموں سے بنی ہے جو ایسے ننھے مُنّے ذرات ہیں جن کا مزید تجزیہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ اُنیسویں صدی کے آغاز میں ویکیوم ٹیوب میں سے بجلی کی رَو گذاری گئی تو ٹیوب میں عجیب سی شعاعیں نمودار ہو گئیں جنہیں کیتھوڈین کا نام دیا گیا۔ ایک سائنس دان جوزف تھامسن نے کہا کہ یہ ذرات کی لہریں ہیں۔ اِن ذرات کو آج کل ہم الیکٹران کہتے ہیں جو توانائی کے ریزے ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں لارڈ ردرفورڈ نے نائٹروجن گیس میں اِن ذرات سے دھماکا کیا جس سے نائٹروجن بھاری آکسیجن میں تبدیل ہو گئی یعنی ایک عنصر دوسرے میں بدل گیا۔ یہیں سے ایٹم کے تجزیے کی بنیاد پڑی اور اِسی عمل سے بعد میں پلوٹونیم کا نیا عنصر دریافت کیا گیا جسے ایٹم بم میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ ایک سائنس دان لوئی وِکٹر نے ثابت کیا کہ الیکٹران ایک ننھا مُنّا ذرہ ہی نہیں ہے بلکہ روشنی جیسی لہروں پر مشتمل ہے۔ بعد میں پروٹان اور نیوٹران کے ذرات دریافت کئے گئے۔ جیمز چیڈوک نے جس نے نیوٹران دریافت کیا تھا یہ انکشاف کیا کہ نیوٹران میں دوسرے ذرات کی طرح کا برقی چارج نہیں ہوتا۔ ڈنمارک کے ایک سائنسدان نیلز ڈبلو بوہر نے کہا کہ الیکٹران اپنے مرکزے کے گرد یوں گھومتے ہیں جیسے سیارے سُورج کے گرد چکّر لگاتے ہیں۔ بعد میں ہائزن برگ اور شروڈنگر نے اِس خیال کو نادرست قرار دیا۔ بہرصورت اِن انکشافات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ مادہ ٹھوس نہیں ہے بلکہ ذرات پر مشتمل ہے یعنی توانائی ہی کی ایک صورت ہے جو چند نامعلوم قوانین کے تحت مربوط ہو کر ٹھوس مادے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ہر ایٹم کا مرکزا دو قسم کے ذرات سے مرکّب ہے مثبت چارج کے الیکٹران اور بغیر چارج کے نیوٹران۔ اِس مرکزے کے گرد منفی الیکٹران تیزی سے گردش کرتے ہیں ایٹم کے اندرون میں ذرات منتشر ہوں تو دھماکے کے ساتھ بے پناہ توانائی پیدا ہوتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ پروٹان اور الیکٹران ایک دوسرے کی جانب شدید کشش محسوس کرتے ہیں لیکن اپنے ہی نوع کے ذرات سے گریزاں ہیں۔ ہائزن برگ اور شروڈنگر نے ثابت کیا ہے کہ مادہ کوئی ٹھوس شے نہیں ہے۔ میز کرسیاں سورج چاند وغیرہ کو محض 'سلسلۂ واقعات' کہا جا سکتا ہے جو چند قوانین کے تحت صورت پذیر ہوتے ہیں۔

شروڈنگر نے ثابت کیا کہ ایٹم کے اجزاء یعنی توانائی کی لہروں کی حرکت میں آزادہ روی پائی جاتی ہے۔ البتہ اس کی توجیہہ نہیں کی جا سکی۔ ہائزن برگ نے بھی اس خیال پر صاد کیا ہے۔

بڑے سے بڑے ایٹم کا حجم ایک انچ کا $\frac{1}{1000,000,000}$ واں حصّہ ہوتا ہے۔

ایجابیّت

یہ فلسفہ فرانس کے فلسفی اگست کومت نے پیش کیا تھا۔ کومت مشاہدے اور تجربے کو علم کا اصل ماخذ قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم کائنات کی ماہیّت کو نہیں جان سکتے ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ کائنات کی کَل کیسے چل رہی ہے، یہی ہمارا مبلغ علم ہے اور یہی کچھ ہمیں جاننے کی ضرورت ہے؛ جو کچھ انسان کے تجربے میں آتا ہے وہی حقیقی ہے۔ دوسرے الفاظ میں تجربہ ہی حقیقت ہے انسان اپنے تجربے اور مشاہدے سے تجاوز نہیں کر سکتا اس لئے مابعد الطّبیعیاتی بحثوں میں اُلجھنے کے بجائے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کو احسن طریقے سے گذارنے کی کوشش کرے۔ کومت کے خیال میں خدا پر ایمان لانا یا کسی وجودِ مطلق کو ماننا ہمارے تجربے سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ہی وجودِ مطلق کا قائل ہے اور وہ ہے انسانیّت عالیہ۔ انسان کی خدمت اور اُس کی فلاح وبہبود کے لئے کوشش کرنا ہی اُس کے یہاں نیکی ہے۔ اُس نے روائتی مذہب کو ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے انسانیّت عالیہ کے مسلک کو "کلیسائے رُوم بغیر عیسائیت" کا نام دیا۔

کومت کا تاریخی نظریہ یہ ہے کہ ذہنِ انسانی تین ارتقائی مراحل سے گذرا ہے۔ پہلا مرحلہ مذہب کا تھا جس میں واقعات کی توجیہہ یزدانی قوّت کے حوالے سے کی گئی، دوسرا مرحلہ مابعد الطّبیعیات کا آیا جس میں یہ توجیہہ مختلف قوتوں کے حوالے سے کی گئی، تیسرا اور آخری مرحلہ سائنس کا ہے جس میں واقعات کی توجیہہ سبب ومسبّب کے قانون سے کی جا رہی ہے۔ یہی انسانی عقل وخرد کی معراج ہے؛ مذہب اور مابعد الطّبیعیات فکری پہلو سے فرسودہ ہو چکے ہیں۔

کومت کہتا ہے کہ حقیقی علم وہ ہے جو مفید مطلب اور کارآمد ثابت ہو۔ وہ علمی نظریات کو درخورِ توجہ نہیں سمجھتا بلکہ اس بات کی جستجو کرتا ہے کہ کون سا علم انسانی زندگی میں عملاً نتیجہ خیز ثابت ہو

سکتا ہے۔ وہ علم کے صرف عملی پہلوؤں کو اہم سمجھتا ہے کیوں کہ بقول اُس کے سائنس ہمیں یہ تو بتاتی ہے کہ واقعات کیسے رُونما ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتی کہ کیوں رُونما ہوتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے فرانسیسی قاموسیوں کی طرح کومت بھی ذہن کو مادے کا ایک جُز قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ نفسیاتی کیفیت مغز سر کا فعل ہے۔ اُس کے مسلک میں ذہن اور رُوح کے وجود سے اِنکار کیا گیا ہے۔ وہ انہیں محض مابعد الطبیعیاتی مفروضے خیال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم اپنی نفسیاتی کیفیات کا داخلی مُشاہدہ نہیں کر سکتے، ہم تو صرف عملاً نفسیاتی واردات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

فرانسیسی قاموسیوں کی طرح کومت کو بھی اِنسانی ترقّی پر کامل اعتماد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بنی نوعِ اِنسان سائنس کی بدولت ایک مثالی معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ اِنسانیت عالیہ کے نصب العین کی عملی ترجمانی کو ترقّی کا نام دیتا ہے اور قدیم مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی روایات کو ترقّی کے راستے میں حائل خیال کرتا ہے۔ اُن کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے "مُردے زندوں پر حکومت کر رہے ہیں"۔ کومت کی اِیجابیت نے سٹوارٹ مِل، ولیم جیمز، ڈیوی، رینان اور درخائیم کے افکار کو مُتاثر کیا تھا۔

ایراس

افلاطون کا آفاقی عشق۔ فرائڈ نے یہ ترکیب ہمہ گیر جنسی کشش کے مفہوم میں استعمال کی ہے۔

یُونانیوں کے عشق کے دیوتا کا نام۔

ایلچی

سفیر کے معنیٰ میں منگولی زبان کا لفظ ہے۔

ایل

عبرانی میں ایل اور عربی میں اِلٰہ کا معنیٰ ہے "قُوّت"، ایل سامیوں کے خدا کا قدیم نام ہے۔

ب

باب

شیخیہ فرقے کے شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امام غائب یا مہدی موعود اور خلقِ خدا کے درمیان ایک ضروری واسطہ باب (دروازہ) ہوتا ہے جس سے وہ بندوں سے اپنا رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ مرزا علی محمد نے ۱۲۶۰ھ میں جب وہ ۲۵ برس کی عمر کے تھے شیراز میں آ کر دعوی کیا کہ میں وہی باب ہوں۔ ان کے پیرو بابی کہلائے۔ بابی بھی دوسرے باطنیہ کی طرح قرآنی آیات و اصطلاحات کی حسبِ منشا تاویل کرتے تھے۔ مرزا علی محمد باب کو ارتداد کے الزام میں قتل کر دیا گیا۔ بابیوں نے انتقام لینے کے لئے شاہ ایران ناصر الدین پر قاتلانہ حملہ کیا لیکن وہ بال بال بچ گیا۔ اٹھارہ بابیوں کو سازش کے الزام میں موت کی سزا دی گئی۔ ان میں بابیوں کے مشہور نغز گو شاعرہ اور نقیبہ قرۃ العین بھی تھی جسے ایک گڑھے میں دھکیل کر اسے مٹی سے پاٹ دیا گیا۔

بابل

بابِ ایل یعنی دروازۂ خداوند قدیم عراق کا سب سے بڑا شہر تھا جو دو ہزار برسوں تک دنیا بھر کی تجارت اور تمدن کا مرکز بنا رہا۔ یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے اس کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ شہر مربع شکل میں دریائے دجلہ کے دونوں کناروں پر تعمیر کیا گیا تھا اور اس کا محیط ۵۶ میل تھا۔ اس میں بعل دیوتا کا عظیم الشان معبد تھا جس کے کھنڈر کو آج کل منارۂ بابل کہتے ہیں۔ اس منارے کی بالائی منزل پر بعل دیوتا کے لئے ایک کمرہ تعمیر کیا گیا تھا جس کی دیواریں ۴۸ فٹ بلند تھیں اور ان کے باہر کی جانب سونے کے پتروں اور نیلگوں روغنی اینٹوں سے کاشی گری کی گئی تھی۔ ان دیواروں کی چمک دمک میلوں تک دکھائی دیتی تھی۔ منارے اور معبد کی کل بلندی ۲۸۸ فٹ تھی۔ بعل دیوتا کا بت خالص سونے

کا بنایا گیا تھا۔ اُس کے قدموں میں سیروش یا اژدہائے بابل کا مجسّمہ تھا۔ بالائی منزل میں ایک منتخب حسینہ رہتی تھی جسے عروسِ بعل کہتے تھے۔

بابل کے باشندے مشہور تاجر اور صنّاع تھے۔ دریائے دجلہ شہر کے بیچوں بیچ بہتا تھا۔ اُس میں دُور دراز کے ملکوں کا سامانِ تجارت کشتیوں میں لد کر آتا تھا۔ بابلیوں کی تجارت چین، ہند، رُوم، مصر اور فلسطین تک پھیلی ہوئی تھی۔ اِن ممالک کے سوداگر قافلوں کی صُورت میں اپنے ہاں کی مصنوعات اور اجناس فروخت کے لئے لاتے تھے۔ اِن تاجروں کے واسطے سے بابل کے دیو مالائی قصے، قوانینِ حمورابی، علمِ ہیئت و نجُوم، ریاضیات، کہانت اور سحر و سیمیا کی اِشاعت مُتمدّن اقوام میں ہوئی اور بابلی روایات دُنیا بھر کے مذاہب و ادیان، عُلوم و فنون اور صنائع بدائع میں نفوذ کر گئیں۔ بنی اسرائیل بابل کی اسیری کے دوران میں صابئیت کے بہت سے عقائد اور شعائر اپنے ساتھ لے گئے جن میں کہانت، فرشتوں، جنّوں اور شیطان کے تصوراّت خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اِسی طرح شجرِ حیات، بہشت، عالمگیر سیلاب کی دیو مالائی روایات بھی بابلیوں ہی سے اخذ کی گئی ہیں۔ ۵۳۹ ق م کو روشِ کبیر شاہِ ایران نے بابل فتح کیا اور اِس کے ساتھ ہی اِس عظیم الشان شہر کی عظمت خاک میں مِل گئی۔

بارھہ

سؤر کو کہتے ہیں۔ کشمیر کا ایک شہر بارھہ مُولہ کہلاتا ہے کیوں کہ وہاں وِشنو کے اوتار بہ شکلِ خنزیر کا بُت رکھا ہے۔

باشا

بھانڈ کو کہتے ہیں۔ مکار اور چالاک آدمی کو بھی پنجابی میں باشا کہا جاتا ہے۔

بازی گر

پنجاب کا ایک خانہ بدوش قبیلہ جس کے نٹ رسّے پر کرتب دکھاتے ہیں۔ کرتب دِکھانے والی عورت کو کبوتری کہتے ہیں۔ یہ لوگ بندر دیوتا ہنومان کی پُوجا کرتے ہیں کیوں کہ بندر قلابازیاں لگانے میں تیز ہوتا ہے۔ اِن کا خیال ہے کہ ہنومان اُنہیں رسّے پر سے گِرنے سے بچاتا ہے۔

بامیان

افغانستان کی ایک مشہور آبادی جہاں ایک عظیم قلعے کے کھنڈر بکھرے پڑے ہیں۔ اِس وادی کے کوہستان میں بارہ ہزار غار ہیں جہاں کسی زمانے میں بودھ سوامی بُود و باش رکھتے تھے۔ ان غاروں کے در و دیوار پر استرکاری کر کے تصویریں بنائی گئی ہیں جنہیں شماج کہتے ہیں۔ بعض غار اتنی بُلندی پر واقع ہیں کہ بودھوں کو ٹوکروں میں بٹھا کر اور کھینچ کر اوپر نیچے لایا جاتا تھا۔ یہاں تین عظیم الجثّہ مجسّمے ہیں۔ مرد کا بُت اسّی گز اونچا ہے، عورت کا پچاس گز اور بچے کا پندرہ گز طویل ہے۔ یہ بُت چٹانوں میں سے تراش کر بنائے گئے ہیں اور گوتم بدّھ، اُس کی زوجہ یشودھرا اور بیٹے رہولا کے بتائے جاتے ہیں۔ چنگیز خان نے اِس وادی کو آباد کرنے سے منع کر دیا تھا جب سے ویران پڑی ہے۔

باطنیّہ

مُسلمانوں کے بعض غالی فرقے جو قُرآن کی تمثیلی تفسیر کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہر ظاہر کا باطن ہوتا ہے جسے صرف امام ہی سمجھ سکتا ہے۔ سبعیّہ، قرامطہ، شلمغانیہ، راوندیہ، صباحیہ، نزاویہ، دروز، علی الٰہیہ وغیرہ باطنیّہ ہیں۔ اسمٰعیلیہ (پیروان آغاخان) اور بوہرے بھی باطنیّہ میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ تناسخ ارواح اور اوتار پر بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُن کے امام میں خدا حلول کر جاتا ہے۔ اسمٰعیلیہ کو تعلیمیہ بھی کہتے ہیں۔ یہ محمّد بن اسمٰعیل کو آخری امام مانتے ہیں۔ گلگت میں انہیں مولائی کہا جاتا ہے۔

بُت

فارسی زبان کا یہ لفظ بدّھ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ مہایان فرقے کے بودھوں نے گوتم بدّھ کے مجسّمے بنانا شروع کئے اور اُن کی پوجا کرنے لگے۔ ایرانیوں نے ہر مورتی کو بُت کہنا شروع کیا۔ بُتوں کو خوبصورت وضع میں تراشا جاتا تھا۔ اِس لئے فارسی والے اُس پُرشباب حسینہ کو بھی جس کے بدن کے زاویے اور خطوط سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں بُت اور معشوق کہنے لگے۔

بخشی

: تاتاری بودھ بھکشوؤں کو بخشی کہتے تھے اور بھکشوؤں کو محکمہ مالگذاری میں عہدے

دیتے تھے۔ بعد میں اِس عہدے کے لئے بخشی کا لفظ رواج پا گیا۔

بدویّت

بدویّت یا صحرائیت حضارت اور تمدّن کی اُلٹ ہے۔ بدویّت پسند تہذیب و تمدّن کی ترقّی سے نالاں ہیں اور دوبارہ فطرت کی طرف لوٹ جانے کی دعوت دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں سائنس کی اِشاعت نے انسان کو دلی خوشی سے محروم کر دیا ہے۔ یہ لوگ خرد دشمن بھی ہوتے ہیں کیوں کہ خرد مندی بداہتہً ترقّی پسندی کی مُقتضی ہوتی ہے۔ روسو، ٹالسٹائے، جارج برنارڈ شا، اقبال اور سولزے نِتسن بدویّت پسند ہیں اور مُعاشرۂ انسانی کو عُلومِ تحقیقی کی روشنی میں آگے کی طرف بڑھانے کے بجائے پیچھے کی طرف دھکیل دینا چاہتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ خوشی فطرت کی گود میں رہ کر میسّر نہیں آتی بلکہ اِس کی تسخیر سے ارزانی ہوتی ہے۔

بردہ فروشی

شاہیّت کے دور میں بردہ فروشی کا کاروبار ہر کہیں پھیل گیا جنگی قیدیوں کو غلام بنا کر بیچ دیتے تھے۔ بڑے شہروں میں نخاس یا بردہ فروشی کا بازار موجود تھا جہاں دور دراز کے ملکوں سے لائے ہوئے غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ انہیں گاہک بھیڑ بکریوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر خریدتے تھے۔ بعض اوقات غلاموں کی تعداد شہریوں سے بھی بڑھ جاتی تھی۔ ارسطو نے غلاموں کو ریاست کے لئے ضروری قرار دیا ہے تاکہ شہری روزمرّہ کے کاموں سے آزاد ہو کر نظم و نسق کی طرف توجّہ دے سکیں۔ اشوریا اور بابل میں آختہ کئے ہوئے غلام محل سراؤں میں لونڈیوں کی حفاظت پر مامور تھے۔ اسلامی ممالک میں انہیں خنثیٰ، خواجہ سرا، خوجہ، شیخ کہہ کر بُلاتے تھے۔ روما میں غلاموں کی کثرت تھی۔ بعض اُمراء کے پاس سیکڑوں غلام تھے۔ جب کبھی کوئی غلام ظلم سے تنگ آ کر اپنے آقا کو قتل کر دیتا تو قاتل کے ساتھ اُس گھر کے سارے غلاموں کی گردن مار دی جاتی تھی۔ ۷۳ ق م میں سپارٹاکس کی بغاوت تاریخِ عالم کا ایک ولولہ انگیز باب ہے۔ سپارٹاکس نے بھگوڑے غلاموں کی فوج اکٹھی کی اور کئی برس روما کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیتا رہا۔ آخر مغلوب ہوا، اُسے لڑتے لڑتے

ہزار ساتھیوں سمیت، میلوں تک سولیاں کھڑی کر کے اُن پر گاڑ دیا گیا۔ عربوں نے ایران اور شام فتح کیے تو لاکھوں عورتوں اور مردوں کو لونڈی غلام بنا لیا۔ بغداد، سامرّا، حلب اور دمشق میں بڑے وسیع پیمانے پر بردہ فروشی کا کاروبار ہونے لگا۔ عرب بردہ فروش (انہیں جلّاب کہتے تھے) افریقہ کے ساحلی علاقوں پر دھاوے کر کے ہر سال ہزاروں حبشی عورتیں مرد پکڑ لاتے تھے اور نخّاس میں بیچتے تھے۔ خلفاء بنو اُمیہ اور بنو عباس کے محلوں میں منتخب حسین لونڈیاں رکھی جاتی تھیں۔ بردہ فروش خوبصورت نوخیز لونڈیوں کو ناچ گانے کی تعلیم دلا کر اُمراء کے یہاں بیچ دیتے تھے۔ مکّہ اور مدینہ ناچ گانے کے مرکز بن گئے جہاں کی تربیت یافتہ کنیزیں گراں قیمت پر بکتی تھیں۔ عربوں نے افریقہ کے شمال مغربی ساحلی علاقہ ہسپانیہ اور صقلیہ فتح کیے تو وہاں بھی بردہ فروشی کا کاروبار چمک اُٹھا۔ اضلاع متحدہ امریکہ کی آبادکاری کے دوران میں بردہ فروشوں نے لاکھوں حبشیوں کو وہاں فروخت کیا۔ انہی حبشی غلاموں نے اضلاع متحدہ کے بنجر علاقے اپنا خون پسینہ ایک کر کے آباد کیے تھے۔ اِن کی اولاد سے آج بھی کروڑوں حبشی وہاں موجود ہیں۔ روس میں غلام کھیتوں سے وابستہ تھے اور کھیت کے ساتھ اُنہیں بھی بیع کر دیا جاتا تھا۔ ۱۸ ویں صدی کے اواخر میں دُنیا بھر کے روشن خیال دانشوروں نے غلامی اور بردہ فروشی کے اِنسداد کی تحریک چلائی۔ ڈنمارک نے ۱۷۹۲ء میں غُلامی کو خلاف قانون قرار دیا۔ اُس کی تقلید کرتے ہوئے اِنگلستان نے بھی ۱۸۰۷ء میں بردہ فروشی اور غُلامی کا انسداد کر کے اِس پُرانی لعنت کا خاتمہ کر دیا۔

برہمن

یہ لفظ تین معنی میں آیا ہے۔ (۱) ___ جاتی: برہمنوں کی جاتی سب سے افضل و برتر ہے۔ منوسمرتی میں کہا گیا ہے کہ برہمن دیوتا ہیں، وہ پوجا پاٹھ کی رسمیں انجام نہ دیں تو سورج طلوع نہیں ہوگا۔ وہ اپنے منتروں سے دیوتاؤں کو بھی مغلوب کر سکتے ہیں۔ (۲) ___ برہمن وہ کتابیں ہیں جو ویدوں کے بعد لکھی گئیں اور جن میں پوجا پاٹھ کے طریقے درج ہیں۔ (۳) ___ اُپنشد کی زبان میں برہمن وُجودِ مُطلق ہے جو کائنات کے ساتھ مُتحد ہے۔ جیو آتما یا شخصی رُوح اور برہمن اصلاً ایک ہی ہیں۔

برہنگی: قدیم زمانے میں برہنگی کو صداقت اور پاکیزگی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ لوگ

معبدوں اور بتوں کا طواف مادر زاد برہنہ ہو کر کرتے تھے جیسا کہ سکندرِ اعظم نے اکیلیس کی قبر کا کیا تھا۔ اسلام سے پہلے عرب حج کے موقع پر برہنگی کی حالت میں کعبہ کا طواف کرتے تھے۔

بُز

بُز کا معنیٰ ہے کپڑا۔ بزّاز کپڑا بیچنے والا اور بزار جہاں کپڑا بیچنے کی دکانیں ہوں۔

بکارت

علم الانسان کے طلبہ کہتے ہیں کہ زرعی انقلاب کی ابتدائی صدیوں میں مادری نظام معاشرہ قائم رہا جس میں ایک ہی قبیلے کے مرد عورتیں مِل جُل کر رہتے تھے اور اُن میں خوراک اور عورت کا اشتراک تھا۔ اِس زمانے میں دوشیزگی یا بکارت کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی بلکہ مرد باکرہ سے بیاہ کرنے سے کتراتے تھے کیوں کہ وہ خونِ بہانے سے سخت خائف تھے جیسا کہ آج کل کے بعض افریقی اور آسٹریلیائی قبائل کے مشاہدے سے معلوم ہوا ہے۔ دلہن کی رخصتی سے پہلے اُس کا ازالۂ بکارت کسی پروہت یا اجنبی سے کرایا جاتا تھا۔ زرعی انقلاب کے بعد دوسری قدروں کی طرح کنوارپنے کی قدر بھی بدل گئی۔ اب شخصی املاک معاشرے کا محور بن گئی تھی اِس لیئے ہر باپ چاہتا تھا کہ اپنی جائداد یا اراضی اپنے ہی صُلبی فرزند کے لیئے ورثے میں چھوڑے۔ لہٰذا بکارت کو اہم سمجھا جانے لگا۔ اکثر قدیم اقوام میں رواج تھا کہ بیاہ کی رات کی صبح کو بستر کی چادر ملاحظہ کی جاتی تھی اور اگر دلہن کی بکارت کا ثبوت مِل جاتا تو اُسے قبیلے کے گھر گھر میں پھرایا جاتا تھا۔ یورپ کے ملکوں میں ۱۵ ویں صدی عیسوی تک دوشیزہ کو لوہے کی پیٹی پہنا دیتے تھے۔ بیاہتا عورتوں کو بھی "عصمت کی پیٹی" پہنائی جاتی تھی۔ صنعتی انقلاب کے بعد سیاسی، معاشی اور اخلاقی قدریں بدلتی جا رہی ہیں اور اب بکارت کو بھی اگلی سی اہمیت حاصل نہیں رہی۔ اضلاع متحدہ امریکہ اور یورپ کے بعض ممالک میں نوخیز لڑکیاں بکارت کو مصیبت سمجھ کر جلد از جلد اِس سے چھٹکارا پانے کی آرزومند ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ روز بروز کنواری ماؤں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

بہادر : تاتاری زبان میں دلیر آدمی کو بگھاتر کہتے تھے جو فارسی میں بہادر بن گیا۔ پنجابی

میں بگھوتر احمق کو کہتے ہیں

بنجارا

یہ لفظ بنج سے ہے جس کا معنیٰ ہے بیوپار۔ پنجابی کا ونج۔ بنجارے اناج کے سوداگر تھے جو چل پھر کر اناج کی تجارت کرتے تھے۔ پنجابی کے ونجارے۔

بندوق

بندوق کا اصل معنیٰ کمان کا ہے جس سے تیر پھینکتے تھے۔

بودلے

پیر بودلا کی اولاد سے ہیں۔ پنجابی میں بھولے بھالے آدمی کو بودلا کہتے ہیں۔

بورژوا

لفظ بورژ سے مشتق ہے جس کا معنیٰ ہے منڈی۔ اِس لئے تجارت پیشہ کو بورژوا کہنے لگے۔ سیاسیات کی اصطلاح میں صنعت کار، ساہوکار، جاگیردار، اجارہ دار اور بڑے بڑے تاجر سبھی بورژوا میں شامل ہیں جو محنت کشوں کا استحصال کر کے دولت سمیٹتے ہیں۔

بھائی پھیرو

بھائی پھیرو سخی سرور کا ایک معتقد تھا جس کی درگاہ موضع میانکے نزد چونیاں ضلع لاہور میں ہے۔ کسان گردباد آتے دیکھیں تو "بھائی پھیرو تری سرکار" کہہ کر اُس سے پناہ مانگتے ہیں۔

بھائیاری

دکن کے جنگلی قبائل میں برادری کو بھائیاری کہتے ہیں۔ یہی ترکیب پنجابی میں بھائی چارا کی صورت میں موجود ہے۔

بھان متی

کالا جادو ہے جو حیدرآباد دکن میں کیا جاتا ہے۔ اس سے جسم پر کالے دھبّے نمودار ہو جاتے ہیں اور معدے میں سخت درد ہونے لگتا ہے۔ جس شخص پر یہ جادو کیا جائے وہ دیوانہ وار ناچنے لگتا

ہے ۔جادوگرنیاں اپنی مخالف عورتوں کے ایام روک دیتی ہیں اور اُن پر مرگی کا دورہ ڈال دیتی ہیں۔

بھیڑی

کسی ولی کی قبر پر رکھا ہوا پتھر جسے مقدّس سمجھا جاتا ہے بھیڑی کہلاتا ہے۔حاجت مند لوگ اس پر مَنتیں مانتے ہیں۔ یہ پتھر مدفون ولی کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ مثلاً بھیڑی شاہ رحمٰن۔

بھنگ

مشہور نشہ آور جڑی بوٹی ہے جسے سبزی ، سبز پری ، سردائی اور بوٹی کہتے ہیں۔ ملنگ بڑے شوق سے سردائی گھوٹ کر پیتے ہیں۔ جوان لڑکیوں کو ورغلانے اور بے آبرو کرنے کے لئے عیار ملنگ اُنہیں مٹھائی میں بھنگ ڈال کر کھلاتے ہیں۔ بھنگ کا نشہ طلوع ہونے سے آدمی بڑی چونچالی محسوس کرتا ہے اور اپنے سامنے ہر شخص اور ہر شے کو حقیر و صغیر محسوس کرتا ہے۔ حسن بن صباح اپنے فدائیوں کو بھنگ (حشیش ، جس سے اُن کا نام حشیشین پڑ گیا تھا) پلا کر اپنی بنائی ہوئی جنّت کی سیر کراتا تھا جہاں وہ حسین عورتوں میں گھرے شرابِ ناب کے ساغر لنڈھایا کرتے ۔ کچھ روز کے بعد پھر انہیں بھنگ پلا کر باہر نکال دیتے تھے ۔ وہ واپس جانے پر اصرار کرتے تو کہتے تم ہمارے فلاں دشمن کو قتل کرو تو جنّت میں باریاب ہو سکو گے ۔ اِس طرح کئی سلاطین اور اُمرا کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا ۔ سکھوں کو بھنگ پینے کی ترغیب دی گئی تھی تاکہ وہ لڑائی میں دلیری سے دشمن کا مقابلہ کریں۔

بھگتی لہر

چھٹی صدی عیسوی تک ہندو چار ویدوں اور اُن کے دیوتاؤں کو بھول چکے تھے اور تِرمُورتی (وشنو ، شیو ، برہما) کی پوجا رواج پا چکی تھی ۔ پرانوں میں کہا گیا کہ سنسار چکّر سے نجات پانے کے لئے بھگتی (عشق) ضروری ہے چنانچہ وشنو اور اُس کے اوتاروں رام اور کرشن کی محبت ہی کو بھگتی کہا گیا ہے ۔ اِس کے ساتھ ساتھ شکتی پوجا اور تنتر مت کی بھی اشاعت ہوئی ۔ شیو کی زوجہ کی پوجا شکتی کے نام پر کرنے لگے اِسے مہا مَیا (بڑی ماں) بھی کہتے تھے ۔ آٹھویں صدی میں بُدھ مت کے زوال کے ساتھ وشنو اور اُس کے اوتاروں رام اور کرشن کے پجاریوں نے بھگتی لہر کا آغاز کیا ۔ اُن کے

خیال میں بھگت کا رشتہ وشنو کے ساتھ وہی ہے جو پتنی کا اپنے پتی سے ہوتا ہے۔ بھگتوں کے کلام میں بار بار آتا ہے۔ "میں اپنے بھگوان سے بیاہ کروں گی" رام پجاریوں میں تلسی داس اور کرشن پجاریوں میں راجکماری میراں بلند پایہ شاعر ہوئے ہیں۔ بنگال اور بہار میں بھگتی کو چیتنیہ، سور داس اور چنڈی داس نے پھیلایا، اضلاع متحدہ آگرہ و اودھ میں رام نند اور کبیر نے اس کی اشاعت کی اور پنجاب میں گورو نانک نے اس کی آبیاری کی۔ بھگت شاعروں نے سنسکرت کے شاعر جے دیو ــــ اس کی نظم گیتا گووندا کے نام سے مشہور ہے ــــ کی طرح جیو آتما کی علامت رادھا کو اور برہمن کی علامت کرشن کو بنا دیا۔ رادھا کی طرح آتما بھی اپنے محبوب ازلی یا برہمن کے فراق میں تڑپتی رہتی ہے اور اُس کے وصال سے شاد کام ہوتی ہے۔

بھُوت

یہ لفظ سنسکرت کے مادہ 'بھُو' سے ہے جس کا معنیٰ ہے "ہو جانا، بن جانا" کہتے ہیں کہ خودکشی کرنے والے یا قتل ہو جانے والے کی رُوح خبیث بھُوت بن جاتی ہے۔ بے اولاد کی رُوح بھی بھُوت بنتی ہے جسے اَوت یا اوتر کہتے ہیں۔ بھُوت ویران جگہوں میں بسیرا کرتے ہیں اور روشنی، خوشبو، ہلدی، حِنا، حرمل، لوہے، آگ، نمک اور فیروزے سے دُور بھاگتے ہیں۔

بہشت

عربی میں اِسے جنّت کہتے ہیں جس کا معنیٰ ہے وہ سرزمین جو درختوں کی کثرت سے ڈھکی ہوئی ہو یعنی گھنا باغ۔ فردوس پہلوی زبان کا لفظ پیرا دوزا (سبزہ زار جس کے گرد باڑ لگا دی جائے) کا معرّب ہے۔ یہی انگریزی کا پیراڈائز بھی ہے۔ ہندو اِسے سورگ، بیکنٹھ یا اندرلوک کہتے ہیں۔ عہد نامۂ قدیم میں باغِ عدن کا ذکر آیا ہے جسے چار دریا دجلہ، فرات، جیحوں اور فیسوں (سیوں) سیراب کرتے ہیں۔ اِسلامی روایات میں جنّت آٹھ[۸] ہیں جنھیں ہشت بہشت کہا جاتا ہے: دارالجلال جس میں موتیوں کے محلات ہیں، جنّت الماویٰ جس میں زرد تانبے کے محل ہیں، جنّت الخلد جس کے محل زرد مونگے کے ہیں، جنّت النعیم میں سفید ہیرے کے محل ہیں، جنّت الفردوس جو زرِ سُرخ

کا تعمیر کیا گیا ہے۔ جنّت العدن سرخ موتیوں کا بنا ہے، جنّت الفزار مشک کا اور دار السلام لعل سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اِن میں سرسبز پھل دار درخت ہیں جنھیں دودھ اور شہد کی نہریں سیراب کرتی ہیں۔ اہلِ جنّت کی خدمت پر غلمان یعنی سادہ عذار لڑکے اور خوبصورت حوریں جن کا رنگ نکھرا ہوا گورا اور آنکھوں کی پُتلیاں گہری سیاہ ہیں، مامور ہوں گی۔ مجوسیوں کے بہشت میں اُبھری ہوئی چھاتیوں والی پریکا (پریاں) بہشت کے مکینوں کا جی بہلائیں گی۔ اوستا میں فردوس کے دربان فرشتے کا نام دوہومنو ہے جب کہ مسلمانوں میں رضوان بہشت کا محافظ ہے۔ ہندو مت کے اِندر لوک میں سونے کے محل ہیں، جواہرِ آبدار سے آراستہ، ہر طرف باغ خوشنما موجود ہیں نہریں بہہ رہی ہیں پھول کھل رہے ہیں، بیلیں لہلا رہی ہیں، درخت ہر جگہ چھا رہے ہیں گندھرو (آسمانی گویّے) کے سازوں کی گت پر اپسرائیں ترغیب آواز انداز میں ناچ رہی ہیں۔ ناروے سویڈن کی دیو مالا میں جس جنّت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اُس میں جنگجو سوُرمے ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہتے ہیں۔ جو مر کر گرتا ہے وہ پھر زندہ ہو جاتا ہے۔ یونانی فلاسفہ کا بہشت خانۂ بے تشویش ہوگا جس میں فلسفی محویّت کے عالم میں سر جھکائے بیٹھے کائنات کے مسائل پر غور و فکر کیا کریں گے۔

بیاہ کی رسمیں

دُنیا بھر کی اقوام میں بیاہ کی رسمیں دُلہا دُلہن کو نظرِ بد اور خبیث ارواح کی کارستانی سے محفوظ رکھنے کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ دُلہا دُلہن پر ہر کس و ناکس کی نگاہ پڑتی ہے اس سے یہ واہمہ پیدا ہوا کہ ہو سکتا ہے بیاہ کے گھر میں کوئی ایسی عورت یا مرد بھی موجود ہو جو نظرِ بد رکھتا ہو۔ بیاہ سے پہلے ہمارے ہاں دُلہا دُلہن کو مانجھے بٹھایا جاتا ہے اور وہ معمولی میلے کچیلے کپڑے پہنتے ہیں تاکہ اُن کا حُسن و جمال نظرِ بد سے بچا رہے۔ سہرا باندھنے کا مقصد بھی یہی ہے۔ بد رُوحوں کو بھگانے کے لئے دُلہا کے ہاتھ میں لوہے کی چھڑی دی جاتی ہے۔ ہندوؤں کے یہاں دُلہا دُلہن کو اگنی کنڈ کے گرد سات چکّر لگوائے جاتے ہیں اور دھرو (قطب ستارہ) کے درشن کرائے جاتے ہیں تاکہ اُن کی برکت سے وہ بھوتوں پریتوں سے بچے رہیں۔ مسلمانوں میں آرسی مصحف کی رسم ادا کرنے کا مقصد بھی یہی ہے اگرچہ بظاہر

اس میں دُلہا دُلہن کا ایک دوسرے کو دیکھنا مقصود ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں شادی کے دن سے پہلے مہندی اور تیل کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ سات سُہاگنیں دُلہن کے بالوں میں تیل چواتی ہیں۔ مہندی کو بدارواح کے بھگانے کا موثر وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ تیل کی رسم میں دُلہن جس کنواری لڑکی کی پیٹھ تھپکے اُس کا بیاہ اُسی سال ہو جاتا ہے اس لئے کنواری لڑکیاں دُلہن کا گھیرا ڈالے رہتی ہیں۔ وہ اپنی کسی پیاری سہیلی کی پیٹھ پر ہاتھ مار دیتی ہے۔ کافرستان میں دُلہا دُلہن کے ناپ کی دو چھڑیاں لے کر اُنہیں آپس میں مضبوطی سے باندھ دیتے ہیں چلئے نکاح ہوگیا۔ یہ چھڑیاں اُنہیں دے دی جاتی ہیں۔ جُدائی مقصود ہو تو دُلہا یا دُلہن انہیں کھول دیتی ہے۔

یہودیوں اور اکثر مغربی اقوام میں دُلہا دُلہن پر مُٹھی بھر چاول یا گیہوں نثار کرتے ہیں تاکہ وہ پھلیں پھُولیں۔ ہمارے دیہات میں گھڑولی بھرنے اور کھارے چڑھانے کی رسمیں ڈھول باجوں کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔ لڑکیاں ایک جلوس کی شکل میں گاتی ہوئی گھڑے اُٹھائے جاتی ہیں اور پانی بھر کر لاتی ہیں۔ ان کے ساتھ ڈھول ایک خاص تال میں پیٹے جاتے ہیں۔ اس پانی سے دُلہا دُلہن کو نہلایا جاتا ہے۔ غُسل کے بعد کھارے سے نیچے اُترتے ہوئے دُلہا لوہے کی چھڑی سے چھُونٹریاں توڑتا ہے گویا کنوارپنے کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ بیاہ کی آخری رات کو دُلہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ گاؤں کی گلیوں کا چکّر لگاتی ہے گویا وہ اپنے میکے سے ہمیشہ کے لئے رُخصت ہو رہی ہے۔ اس موقع پر اُس کی سہیلیاں گاتی ناچتی ہیں اور خوب دھما چوکڑی مچاتی ہیں۔ میراثنیں دُلہا کے گھر میں لہک لہک کر گھوڑیاں گاتی ہیں اور انعام پاتی ہیں۔ دُلہن کی رُخصتی پر بابل کے گیت گائے جاتے ہیں جنہیں سن کر آنکھوں میں آنسو چھلک اُٹھتے ہیں۔ بارات عام طور سے تاروں کی چھاؤں میں دُلہن کے گھر پہنچتی ہے تاکہ دُلہا شام کے دُھندلکے میں نظرِ بد سے بچا رہے۔ دُلہا کے پیچھے گھوڑی پر شہ بالا بیٹھا ہوتا ہے تاکہ لوگوں کی نظریں دُلہا سے ہٹ کر پڑیں۔ روما میں دُلہا دُلہن کو گودی میں بھر کر اپنے گھر کی چوکھٹ کے اندر لاتا تھا اور سب عورتیں مرد مل کر " ٹلاسیو " کا نعرہ لگاتے تھے۔ ٹلاسیو روما کا ایک جوان رعنا ہو گذرا ہے۔ ہمارے دیہات میں چوکھٹ پر تیل گرایا جاتا ہے۔

بیٹھک

بیٹھک اصطلاح میں اُس نشست کو کہتے ہیں جو حاضرات ارواح کے لئے کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں عورتیں رُوحوں کو بُلانے کے لئے بیٹھک کرتی ہیں۔ جو عورت حاضرات کرتی ہے وہ جمعرات کے دن عمدہ پوشاک اور زیورات سے آراستہ ہو کر بدن میں خوشبو لگاتی ہے اور بیٹھ کر گانا سُنتی ہے۔ جب کوئی پری یا رُوح اُس کے سر پر آتی ہے تو وہ زور زور سے اپنا سر ہلانے لگتی ہے۔ اس حالت میں دوسری عورتیں اپنی اپنی حاجتیں اُس کے سامنے پیش کرتی ہیں اور وہ اُن کے سوالات کا جواب دیتی جاتی ہے۔ حاضراتِ ارواح کا یہ طریقہ مختلف اقوام میں مختلف صورت میں رائج رہا ہے۔ شمن مت میں بھی کم و بیش اِسی طریقے سے حاضرات کی جاتی تھی۔ جدید حاضرات کا آغاز اضلاع متحدہ امریکہ سے ہوا۔ نیویارک کے نواح میں ہائڈس وِل کی بستی میں ایک کنبہ رہتا تھا: جے ڈی فاکس، اُس کی زوجہ اور دو بیٹیاں مارگریٹ اور کیٹ۔ اِنہیں راتوں کو دستک کی آوازیں سُنائی دیتی تھیں جنہیں وہ ارواح سے منسوب کرنے لگے۔ شُدہ شُدہ اِس بات کا چرچا ملک بھر میں ہو گیا جس سے حاضرات کی شروعات ہوئی اور واسطوں کے کام کو فروغ ہوا۔ واسطے دو قسم کے تھے جسمانی اور رُوحانی۔ جسمانی واسطے کسی تاریک کمرے میں رُوح کو نورانی دھندلکے کی صورت میں دکھاتے تھے اور ان کی زبانی رُوحیں سوالات کے جواب دیتی تھیں۔ امریکیوں نے حاضرات کا یہ طریقہ لال ہندیوں سے لیا ہے۔ لال ہندیوں کے شمن مُردہ عزیزوں کی رُوحوں کو بُلا کر اُن کی مُلاقات رشتہ داروں سے کرواتے تھے۔ امریکیوں نے شمن کو واسطے کا نام دیا۔ راتوں کو ایک خاص کمرے میں اکٹھا ہونا، حاضرین کا واسطے کی مافوق الطبع قوتوں پر اعتماد ہونا۔ واسطے کا اپنے آپ پر وجد و حال طاری کر لینا اور اِس عالم میں رُوحوں کو دکھانا اور اُن کی آوازیں سُنوانا یا اُن سے سوالوں کے جواب لینا یہ سب طریقے لال ہندیوں کے شمن مت سے ماخوذ ہیں البتہ اِن پر سائنس کی اصطلاحات کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ شمن مت میں نیک یا سعد اور بد یا شقی رُوحوں پر عقیدہ رکھتے ہیں اور اِن سے مدد مانگتے ہیں یا دشمنوں کو ایذا پہنچاتے ہیں جب کہ جدید حاضراتِ ارواح میں مُردوں کی رُوحوں کو

بلانے اور اُن سے رابطہ قائم کرنے ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ شمن مرد ہوتے ہیں جب کہ جدید حاضرات میں عام طور سے عورتیں واسطہ بنتی ہیں۔ جدید حاضراتِ قدیم شمن مت ہی کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ سائنس دانوں اور ماہرینِ نفسیات نے واسطوں کا قریب سے مشاہدہ کیا تو اِن میں اکثر عورتیں مکّار ثابت ہوئیں جو چھُپے ہوئے کیمروں سے ارواح دکھاتی تھیں اور خفیہ ٹرانسمٹر سے آوازیں سُنواتی تھیں۔ دیکھنے والے اکثر اثر پذیری کے تحت سمعی و بصری واہموں میں مُبتلا ہو جاتے ہیں اور ایسی شکلیں دیکھتے ہیں یا ایسی آوازیں سُنتے ہیں جن کا وجود اُن کے ذہن سے باہر کہیں نہیں ہوتا۔ دوسروں کو سمعی و بصری واہموں میں مُبتلا کر دینا قوتِ ارادی کا ایک ادنےٰ کرشمہ ہے جس سے واسطہ بننے والی عورتیں کام لیتی ہیں اور سادہ لوح ناظرین کو غچّے دیتی ہیں۔ جدید حاضراتِ ارواح اُن چکّروں میں سے ایک ہے جو طلبِ زر کے لئے "روحانیت" کے نام پر چلائے جا رہے ہیں۔

بتیال

چشموں، کنوؤں اور دریاؤں کی ارواح جو مسافروں کو فریب دے کر جان سے مار دیتی ہیں۔ مرگھٹ یا قبرستان میں اندھیری راتوں کو چمکتا ہوا چراغ یا شُعلہ دکھائی دیتا ہے اُسے اگیا بتیال کہتے ہیں۔ یہ آوارہ بدروُح ہے جو مُردے کے قالب میں گھُس جاتی ہے۔ دراصل یہ شُعلے ہڈیوں کی فاسفورس سے نکلتے ہیں۔

بیساکھی

پنجاب کا مشہور موسمی تہوار جو دیسی مہینے بیساکھ کی پہلی تاریخ کو دھوم دھام سے منایا جاتا ہے کسان ربیع کی فصل پکنے پر اپنی خوشی کا اظہار گا بجا کر اور ناچ کود کر کرتے ہیں۔ نوجوان جاٹ ڈھولوں کی تال پر بڑے جوش و خروش سے بھنگڑا ناچتے ہیں اور گاہلڑ نچا نچا کر بولیاں کہتے ہیں۔ یہ گاہلڑ قدیم ہڑپائی دور سے لنگ کی علامت چلا آ رہا ہے۔ یہ تہوار ظاہراً دراوڑوں سے یادگار ہے۔

بیلا

دریا کا ٹاپو جہاں کائی اور نرکل کا جنگل ہو۔

بیگ

تاتاری زبان میں شہزادے کو بیگ اور شہزادی کو بیگی کہتے ہیں۔ فارسی والوں نے بیگی کو بیگم بنالیا۔

برات

ہُنڈی کو کہتے تھے جسے دیکھتے ہی روپیہ ادا کر دیا جاتا تھا۔ یہ لفظ اصطلاح میں نصیبہ اور مقسوم کے لئے بھی آیا ہے۔ روایت ہے کہ شب برات کو ہر ایک کا نصیبہ معین کر دیا جاتا ہے۔

باسمتی

باسمتی سُکھداس بہترین قسم کا چاول ہوتا ہے جس میں خوشبو (باس) آتی ہے۔ پشاور میں اسے باڑا کہتے ہیں

بھگیلا

حیدر آباد، بہار اور اُڑیسہ کا ایک دستور ہے جس کی رُو سے نادہند مقروض کو قرضخواہ کے گھر میں چاکر بن کے اپنا قرض ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر مقروض ادائیگی سے پہلے مر جائے تو اُس کے بیٹے یا بیٹی سے چاکری کا کام لیا جاتا ہے۔ اِس چاکر کو بھگیلا کہتے ہیں۔

بے معنویّت

مغرب کی ایک جدید ادبی تحریک جو شاعری، افسانے، ناول اور ناٹک میں نفوذ کر گئی ہے اِس کا بُنیادی خیال یہ ہے کہ اِنسان کی زندگی بے معنی، بے مصرف اور بے ثمر ہے۔ دُنیا میں کوئی نصب العین ایسا نہیں ہے جس کے حصول کے لئے عملاً جدّوجُہد کی جائے۔ سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی قدریں کھوکھلی ہیں، شاعر اور قصّہ نویس کا منصب نہ اِنسان دوستی کے نصب العین کی ترجمانی کرنا ہے اور نہ اِنسان کے گُریزپا اور پریشان تجربات کو کسی نوع کی ہئیت یا معنویّت بخشنا ہے۔ یہ نقطۂ نظر اُس عمیق یاسیت اور کلبیّت کی پیداوار ہے جو دو عالمگیر جنگوں کے دوران میں اور ایٹمی ہلاکت خیزی کی دہشت سے صورت پذیر ہوئی ہے۔ کامیو نے "سسی فس کا اسطور" میں مغرب کے اِنسان کی اِس کلبیّت اور بے معنویّت کی پُرلطف ترجمانی کی ہے اور کہا ہے کہ ترّقی کا خیال محض واہمہ ہے۔ اِنسان مُدتوں کی محنت اور کاوش سے قصرِ تمدّن کی تعمیر کرتا ہے، پھر اچانک اُس کی

تخریبی رگ پھڑک اُٹھتی ہے اور اُسے اپنے ہی ہاتھوں سے مسمار کر دیتا ہے۔ ابتدائے تاریخ سے یوں ہی ہوتا آیا ہے اور سدا یوں ہی ہوتا رہے گا اس لئے زندگی میں معنیٰ اور قدر کو تلاش کرنا سعیٔ بے ثمر ہے۔ اس طرزِ فکر و احساس نے اہلِ مغرب کو تنزّل کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ اُن پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی ہے کہ افریقہ، ایشیا اور جنوبی امریکہ کی اقوام جن کے استحصال سے امریکی اور یورپی اجارہ دار بے پناہ دولت سمیٹ رہے ہیں اب بیدار ہو چکی ہیں اور اُن کے معاشی تصرف سے آزاد ہونے کے لئے کشمکش کر رہی ہیں۔ اپنی معاشی اجارہ داری کے خاتمے کے اندیشے نے اُن کی راتوں کی نیند حرام کر دی ہے۔ اسی یاسیّت اور خوف کے باعث وہ انسانی زندگی کو بے معنیٰ سمجھنے لگے ہیں اور اسی کیفیتِ مزاج کی ترجمانی اُن کے قصوں، ناٹکوں اور نظموں میں کی جا رہی ہے۔

بارہ ماسہ

پنجابی لوک شاعری کی مشہور صنف ہے جس میں بارہ دیسی مہینوں کے حوالے سے دردِ فراق کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ہیّت

پنجابی کی خاص بحر ہے۔ ہیّت ایک چھند: شعر یا بند میں دو مصرعے ہوتے ہیں۔ سی حرفی میں چار مصرعوں کا بند یا شعر ہوتا ہے۔ اکثر چار مصرعوں کے بند کو ہیّت کہتے ہیں۔ (بنارسی داس جین)

باورچی

ترکی زبان کا لفظ ہے۔

پازند

قدیم پہلوی زبان کی بدلی ہوئی صورت جو جدید فارسی سے ملتی جلتی ہے اور فردوسی طوسی کی زبان کے مشابہ ہے۔ اِس میں عربی زبان کے الفاظ نہیں ہیں۔

پان اِسلامزم

بلقان کی عیسائی ریاستوں کو سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف اُکسانے کے لئے عہدِ زار شاہی کے روسی ملوکیت پسندوں نے پان سلاوازم کا نعرہ لگایا جس کا مقصد یہ تھا کہ سلاوُنسل کے لوگ بلقان میں جہاں کہیں بھی ہوں متحد ہوکر روسی سلاووں کے ساتھ مل جائیں اور دولتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کر دیں۔ اِس نعرے کے جواب میں سلطان عبدالمجید عثمانی نے پان اِسلامزم کا تصوّر پیش کیا اور دُنیا بھر کے مسلمانوں کو متحد ہونے کی دعوت دی تاکہ وہ اغیار کا مقابلہ کرسکیں۔ یہی پان اِسلامزم تھا۔

پپیہا

مشہور چڑیا ہے جو برسات کے موسم میں گھنے درختوں کی ڈالیوں پر بیٹھ کر اِس جوش سے پی پی پکارتی ہے کہ چاہنے والوں کے دِلوں میں جُدائی کا داغ سُلگ اُٹھتا ہے۔ اِسی کی آواز پر سنسکرت اور ہندی میں محبوب کو پی، پیا یا پیو کہنے لگے۔

پُتر

سنسکرت میں دوزخ کو پُت کہتے ہیں۔ پُتر کا معنیٰ ہے دوزخ سے بچانے والا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جس شخص کا کوئی بیٹا نہ ہو جو اُس کی شرادھ کی رسوم ادا کرسکے وہ سیدھا نرک یا دوزخ میں جاتا ہے اِسی لئے بیٹے کو پُتر کہنے لگے۔

پَت رانی: کسی راجہ کی بڑی مہارانی۔ پَت کا معنیٰ پنجابی زبان میں عزت و وقار کا ہے۔

پتھر کے زمانے

علم الانسان کے طلبہ نے پتھر کے تین زمانے گنائے ہیں جب انسان کے آباؤ اپنے ہتھیار اور اوزار پتھر کے بناتے تھے اور پہاڑوں کی کھوہوں میں بسیرا کرتے تھے۔ ان کے قیاس کی رو سے جاوا سے ملنے والی کھوپڑی کا انسان قدیم ترین پتھر کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ نینڈرتھل کھوپڑی والا درمیانی زمانے سے اور کرومیگنون والا آخری پتھر کے دور کا انسان تھا۔ اس کے بعد دھاتوں کا زمانہ شروع ہوگیا۔ آخری پتھر کے زمانے میں عورت نے گیہوں اگانے کا راز دریافت کیا اور زرعی انقلاب کے لئے راہ ہموار ہوگئی۔

پٹرولیم

پٹرولیم کا معنیٰ ہے "چٹان کا تیل"۔ پٹرا: چٹان ، اولیم: زیتون کا تیل۔

پٹولا

کناری زبان کا لفظ پٹودا کا معنیٰ ہے ریشمی کپڑا۔ پنجابی میں پٹولا گڑیا کے ریشمی کپڑوں کو کہتے ہیں۔ پٹ بہ معنیٰ ریشم سے ہے۔

پدری نظام معاشرہ

تاریخ عالم میں زرعی انقلاب کے بعد پدری نظام معاشرہ قائم ہوگیا جس میں مرد کی سیادت عورت پر مسلّم ہوگئی اور بچے باپ کے نام سے پکارے جانے لگے۔ من چلے جنگجوؤں نے لشکر اکٹھے کئے اور بستیوں پر قبضہ کرکے ریاست کی بنیاد رکھی اور دوسروں پر حکومت کرنے کے لئے قوانین بنائے۔ اس معاشرے میں عورت کا مقام پست ہوگیا اور اسے بھی گائے بیل اور بھیڑ بکری کی طرح ذاتی املاک میں شمار کرنے لگے۔ مردوں کی یہ سیادت صنعتی انقلاب تک قائم رہی جس کے بعد عورت مرد کی برابری کی مدعی ہوکر ابھری ہے اور اپنا صدیوں سے کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرنے کے لئے جدّوجہد کر رہی ہے۔

پدر

باپ کو فارسی زبان میں پدر، سنسکرت میں پتر، یونانی میں پیٹر، جرمن میں واٹر، ڈچ میں

واڈر، ڈینش میں فاڈر، انگریزی میں فادر، فرانسیسی میں پائرے، اطالوی اور ہسپانوی میں پادری، ہندی میں پِتا، پنجابی میں پیو کہتے ہیں۔

پرُوشاپورا

پشاور کا پُرانا نام تھا۔

پشکلاوتی

چارسدہ کا پُرانا نام جس کا معنیٰ ہے "کنوَل کا شہر"۔

پرشاد

دیوتاؤں کا پس خُوردہ جسے پروہت اور پُجاری کھاتے ہیں۔

پری

پرُوں والی خوبصورت عورت جس کا ذکر کہانیوں میں آتا ہے۔ روایت کے مطابق پریوں کا مُلک پرستان کوہ قاف میں واقع ہے۔ قِصّوں میں شہپال کو اِن کا بادشاہ کہا گیا ہے۔ یہی لفظ انگریزی میں فیری ہے۔

پُرش

ہندوؤں کے یہاں کائنات کا تخلیقی اصول یا توانائی جس کے پرکرتی (مادہ) کے ساتھ اِتصال سے کائنات معرضِ وجود میں آئی تھی۔

پرہا

چھوٹا ناگپور کے مُنڈا قبائل میں مختلف گروہ اپنے اپنے ٹوٹم یا نشان سے پہچانے جاتے ہیں۔ اِس قسم کے گروہ کو پرہا کہتے ہیں جس کا ایک سرپنچ ہوتا ہے۔ پنجابی میں یہ لفظ پرھیا ہے جس سے مُراد پنچائیت ہے۔

پرولتاری

محنت کش طبقے کو سیاسیات کی اِصطلاح میں پرولتاری کہتے ہیں۔ اِس ترکیب کا لغوی معنیٰ ہے "وہ شخص جس کی کثرت سے اولاد ہو"

پُران : پُران وہی لفظ ہے جسے ہم پُرانا کہتے ہیں یعنی قدیم۔ آج کل کے ہندو ویدوں کو

بھول چکے ہیں اور پُرانوں کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں، جو تعداد میں اٹھارہ ہیں۔ اِن میں برہما، شیو اور وشنو اور اس کے اوتاروں رام اور کرشن کے حالات اور پُوجا پاٹھ کے طریقے درج ہیں۔ پُرانوں کی تعلیم یہ ہے کہ دیوتاؤں کی پُوجا کرنا اور پُوجا کی رسوم کو ادا کرنا ہر طرح کی نیکی سے بہتر ہے۔ ان میں بھگوت پُران، وشنو پُران، سکند پُران اور اگنی پُران مشہور ہیں۔

پختون

یہ ترکیب پَخت سے مشتق ہے جس کا معنی ہے پہاڑی پختون یعنی پہاڑیوں میں بسیرا کرنے والے۔ یہی لفظ بگڑ کر پٹھان بن گیا۔ محمود غزنوی کے زمانے میں علاقہ قندھار کے رہنے والوں کو افغان کہنے لگے جب کہ سلسلۂ کوہِ سلیمان میں بُود و باش رکھنے والے پختون کہلائے۔ عرب ممالک میں پٹھانوں کو سُلیمانی کہا جاتا ہے۔

پُشکر

اجمیر کے پاس ایک جھیل جسے پکھر بھی کہتے ہیں۔ برہما کا تیرتھ ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ آدمی دُنیا بھر کے تیرتھوں پر جائے لیکن پُشکر میں نہ نہائے تو اس کے نیک اعمال اکارت جائیں گے۔

پروہت

زرعی انقلاب کے بعد ریاست وجود میں آئی تو مذہب کی بھی تنظیم کی گئی۔ بادشاہ خود مہا پُجاری بن بیٹھے اور پُوجا پاٹھ کی رسمیں ادا کرنے کا کام پروہتوں کے سپرد کیا گیا جس سے پیشہ ور مذہبی پیشواؤں کی جماعت بن گئی اور شروع ہی سے ریاست اور مذہب کا اتحاد عمل میں آگیا۔ پروہتوں نے اپنے مذہبی اثر و رسوخ کو حصولِ زر و مال کا وسیلہ بنا لیا۔ وہی بادشاہوں کی رسم تاجپوشی ادا کرتے تھے اس لئے بادشاہ ہر طرح اُنہیں خوش رکھتے تھے۔ پروہتوں کے تموّل کا ثبوت فرعون ریمسیس سوم کے عہد کے ایک تاریخی مخطوطے سے ملتا ہے۔ اِس میں لکھا ہے کہ اُس کے عہد میں پروہتوں کے پاس ایک لاکھ ستّر ہزار غلام تھے، سات لاکھ پچاسی ہزار ایکڑ اراضی اُن کی املاک میں تھی، اُن کے پاس پانچ لاکھ مواشی تھے اور مصر و شام کے ۱۶۹ دیہات معبدوں کے ساتھ وقف تھے۔ یہی حال بابل، اشوریا اور کنعان کا تھا۔ کنعان میں پروہتوں کے لئے عُشر اور صدقہ کے محصول لگائے گئے تھے جو بعد میں

بنی اسرائیل نے بھی اپنالئے۔ پروھتوں نے عشتار، آئسس، اندھتا وغیرہ دیویوں کے معبدوں میں مقدّس عصمت فروشی کا کاروبار جاری کر رکھا تھا۔ یاتری دیوی کے نام پر خرچی دے کر دیوداسیوں سے تمتع کرتے تھے۔ یہ رقم پروھتوں کی جیب میں جاتی تھی۔ گوتم بدھ، کنفیوشس اور یسعیاہ ثانی نے پروھتوں کی دکان آرائی اور دین فروشی کے پردے چاک کئے لیکن سلاطین اور پروھتوں کے اتحاد نے اِن کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ سائنس کے فروغ اور روشن خیالی کے اِس دَور میں بھی پسماندہ ملکوں میں پروھتوں کا اِقتدار برقرار و بحال ہے اور یہ لوگ مذہب کے نام پر سادہ لوح عوام سے روپیہ بٹور رہے ہیں۔ مغرب کے سامراجیوں نے ایشیا اور افریقہ کے ممالک فتح کئے تو وہاں پادریوں کو بھیج دیا تاکہ مُلکیوں کو عیسائی بنا کر انہیں قومیّت اور وطنیّت کے اِحساسات سے محروم کر دیں۔ فی زمانہ تیسری دُنیا کے اکثر ممالک میں دین فروشی کا کاروبار بحال رکھنے کے لئے پروھتوں نے ملکی رجعت پسند جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ اتحاد کر لیا ہے۔

پکھّی وارا

ایک خانہ بدوش قبیلہ جو پرندوں (پکھّی) کے شکار پر گذر اوقات کرتا ہے۔

پُلِ صراط

پہلوی زبان میں اِسے چنوت کہا گیا ہے جس کا معنیٰ ہے اِکٹھا کرنے والا مجوسیّت کی رُو سے ہر شخص کو چنوت کے پُل پر سے گذرنا ہوگا جو بال سے باریک تر اور تلوار کی دھار سے تیز تر ہوگا۔ سعید اِس پر سے آرام سے گذر جائیں گے اور شقی کٹ کٹ کر دوزخ میں جا گریں گے۔

پلیتہ

موم بتی، دھونی کا تعویذ جو حاضراتِ ارواح، آسیب اُتارنے یا جادو کی رسوم ادا کرتے ہوئے جلاتے ہیں۔

پنج پیر

پنج پیروں کا تصوّر برصغیر میں قدیم زمانے سے موجود ہے۔ اِن کے ناموں میں البتہ اختلاف

ہے۔ وارث شاہ نے اپنی ہیر میں حضرات خواجہ خضر، بابا فرید الدین گنج شکرؒ، لال شہباز قلندر، سیّد جلال بخاری اور بہاؤ الدین ذکریا کو پنج پیر کہا ہے۔ لاہور میں خانقاہ پنج پیراں کے نام سے ایک زیارت گاہ موجود ہے۔ اودھ میں پنج پیر کا مت رائج ہے جس میں ہندو مسلم پیر اکھٹے کر دیئے گئے ہیں۔ یہ ہیں ستی، بھیروں، رجب سالار، سکندر دلوانہ، ہتیصلی پیر۔ پنج پیر فی الاصل پنجاب کے پانچ دریاؤں کی علامتیں ہیں۔

پنچال

پنج آل یعنی پانچ بیٹے بجھوا کے جن کی رعائت سے پنجاب کو پنچال کہا جاتا تھا۔ پانڈووں کی رانی دروپدی پنچال کے راجہ دروپد کی بیٹی تھی۔ سنسکرت میں پنچال کو پنچاندا (پانچ دریا) بھی کہا گیا ہے۔ ایرانیوں نے اسے پنجاب (پنج آب) کا نام دیا۔

پنج کلیان

وہ گھوڑا یا بھینس جس کے چاروں کھُر اور ماتھا سفید ہوں۔

پنج گویّہ

ہندو ناپاکی یا نجاست دور کرنے کے لئے پنج گویّہ (گائے کی پانچ چیزیں) دودھ، مکھن، دہی، پیشاب اور گوبر ملا کر پیتے ہیں۔

پھُمنیاں

پنجابی دیہات کا لوک ناچ ہے۔ ناچنے والے ڈھول کی تال پر کبھی جھکتے ہیں کبھی کھڑے ہو جاتے اور ہاتھوں سے تالی پیٹتے جاتے ہیں۔ شروع میں ان کی رفتار سُست ہوتی ہے جو بتدریج تیز ہوتی جاتی ہے۔

پوُجا

قدیم زمانے سے انسان جن اشیاء کی پوجا کرتا رہا ہے اُن کے چھ گروہ ہیں (۱)۔ آسمانی: سورج، چاند، سیارے، گرج چمک (۲)۔ زمینی: دھرتی ماتا (۳)۔ جنیاتی: یونی اور لنگ (۴)۔ حیوانی: سانپ، بیل، گائے وغیرہ (۵)۔ انسانی: آباء و اجداد کی پوجا (۶)۔ یزدانی: دیوتاؤں یا

خدا وند خدا کی پوجا۔

پچھے کٹنی

مکار عورت جو جوان لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر ان کی آبرو کا سودا کرتی ہے۔ اس ترکیب سے پنجابی دیہات کی ایک حکایت وابستہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص کے یہاں مہمان ٹھہرا۔ کئی دن گذر گئے لیکن وہ جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔ آخر تنگ آکر میاں بیوی نے ایک تجویز سوچی۔ عورت کوٹھڑی میں جا کر لکڑی سے پرانی روئی کے لحاف (پچھ) کو زور زور سے کوٹنے لگی اور چیخ چیخ کر گالیاں بکنے لگی۔ مہمان نے گھبرا کر پوچھا یہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ میزبان نے کہا کہ میری عورت بڑی بدمزاج ہے، بچوں کو پیٹ رہی ہے۔ یہ سُن کر مہمان بھاگ گیا۔

پہلوان

پہلوی زبان میں شریف اور خاندانی آدمی کو پہلوان کہتے ہیں۔ اصل لفظ پہلوا تھا۔

پیپل

وشنو کا مقدس درخت جسے ہندو دیوتا کا درجہ دیتے ہیں۔ عورتیں اس کی جڑوں میں دودھ انڈیل کر اس کی پوجا کرتی ہیں اور اس کا پرکما (طواف) کرتی ہیں۔ اس کی ٹہنیوں سے رنگ برنگ کے دھاگے باندھ کر اولاد کے حصول کے لئے منتیں مانی جاتی ہیں۔

پیدائش

انسان کی پیدائش کے بارے میں اقوامِ عالم کی دیو مالا میں مختلف روایات ہیں۔ عہد نامہ قدیم میں ہے کہ خدا نے آدم کا پتلا اپنی ہی صورت پر بنایا اور اس میں اپنی روح (سانس) پھونکی جس سے وہ زندہ ہو گیا پھر ایک دن سوتے میں اُس کی پسلی سے حوا پیدا کی۔ ایک ہندی روایت میں خدا نے پانی میں بیج ڈالا جو انڈا بن گیا۔ اس انڈے میں سے برہما جی نکلے۔ انہوں نے اپنے آدھے جسم کو وِراج (نر) اور آدھے کو شت روپا (ناری) بنایا۔ اِن سے منو جی پیدا ہوئے جن کے سبب دیوتا، آسمان اور زمین پیدا ہوئے۔ افلاطون نے ایک قصے کا حوالہ دیا ہے

جس میں لکھا ہے کہ ابتدا میں ایک ہی متنفس تھا جس کے دو ٹکڑے کر کے نر اور مادہ پیدا کئے گئے۔ اُس کے خیال میں جنسی کشش کا راز اِس بات میں ہے کہ یہ دونوں ٹکڑے دوبارہ ایک دوسرے میں ضم ہونے کے لئے بے قرار رہتے ہیں۔ جاپانی دیو مالا میں بنی نوع اِنسان اِزا ناگی اور اِزا نامی کی اولاد سے ہیں۔

پیشاچی

پیشاچ یا گندے لوگوں کی زبان۔ قدیم آریا شمال مغربی ہند کے اصل باشندوں کو وحشی اور گندا کہتے تھے اِس لئے اُن کی بولی کو بھی پیشاچی کہنے لگے۔

تابوتِ سکینہ

یہودیوں کا مقدس صندوق جس میں جنابِ موسیٰ کا عصا، شریعت کی الواح، مقدس شمعدان اور من کا مرتبان رکھے تھے۔ یہودی اسے میدانِ جنگ میں لے جاتے تھے کہ اس کی برکت سے فتح نصیب ہو۔ اسے کیکر کی لکڑی سے بنایا گیا تھا اور سونے کے پتروں سے منڈھا گیا تھا۔ اس پر کروبیوں کی شبیہیں بنی تھیں جن سے یہواہ جنابِ موسیٰ سے مخاطب ہوا کرتا تھا۔ بنوکد نضر شاہِ بابل نے یروشلم فتح کیا تو مسجدِ سلیمان کے ساتھ تابوت کو بھی برباد کر دیا۔

تاریخی ارتقاء

مورخین تاریخی واقعات کو حتی الامکان صحت اور دیانت سے بیان کرتے ہیں اور فلاسفۂ تاریخ ان کی ترجمانی کر کے تاریخی حرکت یا تمدنی ارتقار کے قوانین دریافت کرتے ہیں تاکہ تاریخ کو سائنس اور فلسفے کا درجہ دیا جائے۔ فلسفۂ تاریخ میں عبدالرحمٰن ابن خلدون کو اولیت کا شرف حاصل ہے جیسا کہ مشہور انگریز مورخ ٹوئن بی نے ابن خلدون کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے تسلیم کیا ہے۔ ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں معاشرۂ انسانی کے ارتقار کے قوانین مرتب کئے اور تاریخ نگاری کو سائنس بنا دیا۔ اس پہلو سے وہ فلسفۂ تاریخ کا بانی ہی نہیں عمرانیات کا موجد بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ابن خلدون کے خیال میں بدوی یا صحرائی انسانی معاشرے میں سبقت کا درجہ رکھتے ہیں کیوں کہ تمام اقوامِ عالم اس ابتدائی مرحلے سے گذر کر تمدن و حضارت کی جانب قدم بڑھاتی رہی ہیں۔ جب صحرائی اور کوہستانی مہذب و متمدن اقوام پر غلبہ پا کر انہیں فتح کر لیتے ہیں تو خود مفتوحین کا تمدن اختیار کر لیتے ہیں اور عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر ابتدائی شجاعت اور

مہم جوئی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ صحرائیوں کا ایک اور ریلا آتا ہے اور ان پر غالب آجاتا ہے۔ یہ چکر یونہی چلتا رہتا ہے وہ کہتا ہے کہ کسی سلطنت کا خاتمہ اتنا ہی قطعی اور یقینی ہے جتنا کہ کسی شخص کا بوڑھے ہو کر موت سے ہمکنار ہونا۔ ابن خلدون نے انسانی معاشرے پر طبیعی اثرات سے محققانہ بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جغرافیائی ماحول کے اثرات سیاسیات اور اقتصادیات ہی پر نہیں ہوتے بلکہ انسان کی شکل وصورت، عادات واطوار اور طرز فکر واحساس پر بھی ہوتے ہیں۔ ویکو، مونٹسکو اور ٹامس بکل نے اس پہلو سے ابن خلدون سے استفادہ کیا ہے اور تاریخی جبریت اور تاریخی عمل کے دولابی (دائرے میں) ہونے کے تصورات بھی اسی سے اخذ کئے ہیں سپنگلر بھی تاریخی جبر کا قائل ہے۔ اس کے خیال میں اقوام عالم عروج، جمود اور زوال کے ادوار سے گذرتی ہیں جیسے انسان بچپن، شباب اور بڑھاپے کی منازل سے گذرتا ہے۔ سپنگلر نے کہا ہے کہ مغربی اقوام تنزل کی شکار ہو چکی ہیں۔ کروچے نے تاریخ کو فلسفے کے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا مشہور نظریہ یہ ہے کہ مذہب بحیثیت ایک زندہ اور فعال قوت کے ختم ہو چکا ہے اور اب آرٹ اس کا نعم البدل بنتا جا رہا ہے۔ ہیگل کا تاریخی نظریہ اس کی مثالیاتی جدلیات سے وابستہ ہے۔ اس کے خیال میں امثال وافکار کا تصادم تاریخی حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ اکابر فلاسفۂ تاریخ میں ٹوئن بی تاریخی عمل میں قدر واختیار کا قائل ہے۔ اس کے خیال میں اگر کسی تنزل پذیر قوم میں اپنی زوال پذیری کا شعور پیدا ہو جائے اور وہ نامساعد حالات کا چیلنج قبول کر لے تو وہ دوبارہ عروج حاصل کر سکتی ہے۔ اس کا نقطۂ نظر مذہبی ہے اور وہ عیسائیت کی ہمہ گیر اشاعت ومقبولیت کو انسانی مشکلات کا واحد حل سمجھتا ہے۔ کارل مارکس نے تاریخ کی جدلیاتی مادی ترجمانی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ طبقاتی کشمکش تاریخی حرکت وارتقار کا بڑا سبب ہے اور تاریخ کے بنیادی عوامل شروع سے معاشی رہے ہیں: پیداوار، تقسیم اور صرف۔ یہی چیزیں بالآخر زندگی کے دوسرے شعبوں کو خواہ وہ مذہبی ہوں یا اخلاقی، فلسفیانہ ہوں یا ادبی ـــــ متاثر کرتی ہیں۔ پیداوار اور اس کے علائق معاشرے کی اقتصادی بنیاد استوار کرتے ہیں۔ مادی اشیاء کی پیداوار کا طریقہ عمرانی، سیاسی

اور رُوحانی اعمال کی تشکیل کرتا ہے۔ انسان کے وجود کا تعیّن اُس کے شعور سے نہیں ہوتا بلکہ اقتصادی و عمرانی احوال اُس کے شعور کا تعیّن کرتے ہیں۔ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اُس نے اپنے خیالات فلسفہ کے مدارسِ فکر، اخلاقی اصول، مذہبی عقائد، جماعتی تعصبات اور فنّی ذوق کو منطقی استدلال سے یہ ارتقاء بخشا ہے۔ یہ اُس کی بھول ہے۔ فی الاصل بُنیادی معاشی عوامل اُس کے خیالات کا رُخ و رجحان متعیّن کرتے ہیں۔ اسی طرح کارل مارکس بھی تاریخی عمل میں جبریّت کا قائل ہے۔ اُس کے خیال میں افراد خواہ وہ کتنے ہی قابل اور ذہین ہوں تاریخ کے رُخ کو موڑ نہیں سکتے۔ وہ کہتا ہے کہ جبر کا شعور ہی ہمیں قدر و اختیار عطا کرتا ہے یعنی انسان اپنے طبیعی احوال کا انتخاب کرنے میں مجبور ہے البتّہ اِس جبر کی حدود میں رہ کر وہ حالات کو بدلنے پر قدرت رکھتا ہے۔

تامل کے الفاظ

انگریزی کے الفاظ آئوری (ہاتھی دانت) ایپ (لنگور) پی کاک (مور) رائس (چاول) اصل میں تامل کے الفاظ ہیں۔

تاش

یہ کھیل چینیوں سے لیا گیا ہے۔ ایک قسم کے ریشمی کپڑے کو بھی تاش کہتے ہیں۔ تاش کا معنیٰ پتھر ہے اسی سے تاشقند ہے۔

تال

موسیقی کی اصطلاح میں ہاتھ پر ہاتھ مار کر (تالی) سُر کو ضبط کرنے کا نام تال ہے۔ مشہور تالیں تعداد میں سترہ ہیں۔ اِن میں سُلفاختہ (دس ماترے۔ اصول فاختہ)، فرودست (۱۴ ماترے) اور پشتو (سات ماترے) ایرانی موسیقی سے یادگار ہیں۔

تان

تان کا لفظی معنیٰ ہے پھیلاؤ جیسے مثلاً چادر تان لینا۔ موسیقی کی اصطلاح میں سُروں کے دلکش پھیلاؤ کو تان کہتے ہیں۔ تان توڑنا؛ سُر کو سَم پہ لاکر ختم کرنا؛ تان میں تکلیں اُڑانا؛ بہت

اونچی تانیں لینا؛ تانوں کے لچھے: گٹکریوں کے زیر و بم)۔ بول تان اُستاد تصدق خاں کی ایجاد ہے۔ اِس میں راگ کے الفاظ کو سُوروں کے مختلف ٹکڑوں میں گایا جاتا ہے اور اِس سے مختلف شکلیں بنتی ہیں۔ بول تان آگرے کی گائیکی کی نمایاں خصوصیت ہے۔ تان کی معروف قسمیں ہیں: شُدھ تان، کوٹ تان، مشرا تان، کمپت تان، النکارک تان، گمک تان، بول تان۔

تاؤمت

چین کا ایک مسلک جس کا بانی لاؤتسے تھا۔ تاؤ سے مراد ہے آفاقی قانون جو یانگ (روشنی، حرکت، قوت) اور ین (تاریکی، جمود) سے بالاتر ہے۔ لاؤتسے اپنے پیروؤں سے کہا کرتا تھا کہ وہ دُنیا سے کنارہ کش ہو کر کسی پہاڑ یا جنگل میں قیام کریں اور فطرت کے نظاروں پر تعمق کیا کریں۔ اُس کی تعلیم تھی "اپنے غرور کو دُور کرو، بلند نظری اور ترقی و تموّل کی خواہش کو تج دو، جدّوجہد کو چھوڑ دو۔ ان باتوں سے تمہارے کردار کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔" تاؤمت کے اثرات چینی مصوّری پر گہرے ہوئے چینی تصاویر میں فطری مناظر کے بڑے حسین نمونے ملتے ہیں جو بعض پہلوؤں سے منفرد اور بے مثال ہیں۔ برٹرنڈرسل نے چینی مصوّری کو دُنیا کی عظیم ترین مصوّری کہا ہے۔

تثلیث

کلیسیائے روم کے اقانیم ثلاثہ ہیں خداوند، رُوح القدس، جناب مسیح۔ تثلیث کا تصور اکثر قدیم اقوام میں ملتا ہے۔ پہلی تثلیث سُمیریوں کی تھی: انُو، انلِل، ایا۔ مصریوں کی تثلیث: اوزیرس، آئسس، ہورس۔ ہندوؤں کی تثلیث جس کی علامت اوُم کا کلمہ ہے: اِندر، وایو، مترا۔

تحریر

تحریر کی ایجاد سے اِنسان نے تہذیب و تمدّن کی طرف بڑا قدم اُٹھایا کیوں کہ وہ اپنے خیالات اور کارناموں کو محفوظ کرنے کے قابل ہوگیا۔ تحریر کا آغاز تصویروں سے ہوا تھا جو پتھر کے زمانے کے غاروں سے دریافت ہوئی ہیں۔ سب سے قدیم تحریر سُمیریوں کی ہے جسے پیکانی رسم الخط کہتے ہیں۔ مصری ہیروغلیفی تصویر نگاری ہی کی صورت تھی۔ کنعانیوں یا فونیقیوں نے سہولت فہم کے لیے

سمیریوں کی پیکانی اور مصریوں کی ہیروغلیفی رسومِ تحریر سے چند علامات لے کر انہیں الفبا کی صورت میں مرتب کیا یہی الفبا آرامی، عبرانی، عربی، یونانی، لاطینی اور سنسکرت اور ان کے واسطے سے دوسری اقوام کی زبانوں میں رواج پاگئی۔ چینی رسم تحریر البتہ خالص ملکی پیداوار تھی اور اُوپر سے نیچے لکھی جاتی تھی۔ اِس کے لیے کئی علامتیں حفظ کرنا پڑتی تھیں۔ موجودہ چینی حکومت نے اسے بہت کچھ آسان بنا دیا ہے۔

تحلیل نفسی

تحلیل نفسی ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ کا مشہور نظریہ اور طریقۂ علاج ہے جو نفسیاتی دباؤ اور ذہنی کشمکش پر مبنی ہے۔ فرائڈ ۱۸۵۶ء میں وی آنا (آسٹریا) کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے نہائت ذہین اور سنجیدہ تھا۔ طبی تعلیم کے دوران میں اُس نے اعصاب پر قابلِ قدر کام کیا اور اپنی تحقیق کے باعث ملک بھر میں مشہور ہوگیا۔ ہسٹیریا پر تحقیقی کام کرتے ہوئے وہ فرانس کے مشہور ڈاکٹر شرکو کے حلقۂ تدریس سے وابستہ ہوگیا جو اس مرض کے علاج کے لئے ہپناٹزم سے کام لے رہا تھا۔ ایک دن ڈاکٹر شرکو نے ڈاکٹروں سے مخاطب ہو کر کہا "فتورِ ذہن کے تمام مریضوں کی جنسی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ خلل ہوتا ہے۔ تم جتنا غور کرو گے اِس خلل کو لازماً پاؤ گے"۔ شرکو کا یہ جملہ فرائڈ نے پلّے باندھ لیا اور یہی خیال اُس کی تحلیل نفسی کا سنگ بنیاد بن گیا۔ پیرس سے لوٹ کر فرائڈ نے ڈاکٹر برائر سے مِل کر کام کرنا شروع کیا۔ ہسٹیریا کی ایک مریضہ کا علاج ہپناٹزم سے کرنے کے دوران میں ڈاکٹر برائر نے محسوس کیا کہ غشی کی حالت میں مریضہ کو اپنی ذات کے بارے میں بے تکان اور بے محابا باتیں کرنے کا موقع دیا جائے تو ہوش میں آنے کے بعد وہ افاقہ محسوس کرتی ہے مزید برآں خود فراموشی کے عالم میں مریضہ کو اپنی گذشتہ زندگی کے وہ واقعات بھی یاد آجاتے ہیں جن سے وہ جذباتی طور پر متاثر ہوئی تھی اور جو بیداری کی حالت میں اُسے یاد نہیں آتے تھے۔ برائر نے اس علاج کا نام طریقۂ گفتگو رکھا۔ مریضہ شفایاب ہوگئی تو فرائڈ اور برائر نے اِس طریقۂ علاج کو کامیابی سے جاری رکھا۔ انہی ایام میں شرکو کے ایک شاگرد پائرے ژینے نے تحتِ شعور کی جانب توجہ دلائی اور ایک مقالے میں ثابت کیا کہ ہپناٹزم کی مدد سے ہسٹیریا کے مریضوں

کی بھولی بسری یادوں کو شعور کی سطح پر لایا جا سکتا ہے جس سے اُس کا جذباتی تناؤ دور ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد براُئر اِس طریقۂ علاج سے دست کش ہو گیا لیکن فرائڈ نے ثابت قدمی سے اِسے جاری رکھا۔ وہ مریض کو آرام سے لٹا دیتا خود اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر بیٹھ جاتا اور مریض کو اپنے متعلق باتیں کرنے کی ترغیب دلاتا رہتا۔ اُس نے محسوس کیا کہ مریض کے ذہن۔ ۔بعد میں اِسے لاشعور کا نام دیا گیا۔۔ کی مزاحمت کے باعث مریض باتیں کرنے میں جھجک محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر سے مانوس ہونے پر یہ مزاحمت ختم ہو جاتی ہے تو مریض کے اسبابِ مرض روشن ہو جاتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں مریض یا مریضہ اپنی محبت معالج کی ذات سے وابستہ کر دیتی ہے۔ یہ مرحلہ بڑا نازک ہے۔ کئی جوان عورتوں نے فرائڈ سے اظہارِ عشق کیا لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ عارضی اور عبوری مرحلہ ہے۔ تحلیل نفسی کے دوران میں دبائی ہوئی اُلجھنیں شعور کی سطح پر اُبھر آتیں اور مریض ذہنی کشمکش سے نجات پا کر شفایاب ہو جاتے تھے۔ کئی برسوں کے تجربات کے بعد فرائڈ نے ڈاکٹر شرکو کی تائید کرتے ہوئے کہا "جنسیاتی محرومی ہی فتورِ ذہن کا اہم سبب ہے"۔ اُس کا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ یہ تھا کہ صحت مند جنسی زندگی بسر کرنے والے بہت کم فتورِ ذہن میں مُبتلا ہوتے ہیں۔ ۱۸۹۹ء میں فرائڈ نے اپنی معرکہ آراء کتاب "خوابوں کی ترجمانی" شائع کی جس سے طبّی اور نفسیاتی حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔ فرائڈ نے ذہن کے تحت شعور کے تصوّر پر غور کرتے ہوئے لاشعور کا انکشاف کیا اور اپنے دوسرے انکشاف لاشعوری دباؤ کے حوالے سے کہا کہ دبائی ہوئی تلخ اور ناگوار خواہشات لاشعور میں جاگزیں ہو جاتی ہیں اور معاشرے کے مطالبات سے ٹکرا کر نفسیاتی نظام کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔

فرائڈ کے خیال میں لاشعور کے عناصرِ ترکیبی تین ہیں (۱)۔۔۔ موروثی جبلّتیں اور طبعی میلانات (۲)۔۔۔ عادات و خصائل جو سن شعور کے ساتھ راسخ ہو جاتے ہیں (۳)۔۔۔ تلخ واردات جو دبا دیئے جاتے ہیں اور لاشعور میں جا کر اُلجھنیں بن جاتے ہیں۔ فرائڈ کے دو شاگرد کارل ژُنگ اور الفریڈ ایڈلر اُس کے ہمہ جنسیت کے نظریے کے باعث اُس سے الگ ہو گئے اور اُنہوں نے

اپنے اپنے مستقل دبستانِ نفسیات کی بنیاد رکھی۔ ژنگ نے اپنے نظریئے کو تحلیلی نفسیات کا نام دیا۔ وہ اجتماعی لاشعور پر زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دیو مالا کے قِصّے، لوک کہانیاں وغیرہ لاشعور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُس کا نقطۂ نظر صوفیانہ اور عارفانہ ہے۔ اُس نے ایک قسم کی ہمہ گیر نفسیاتی توانائی کی جانب توجہ دلائی ہے جو صوفیوں کے اِشراق سے ملتی جُلتی ہے۔ ژنگ تاؤمت، زین بُدھ مت، یوگا اور تحلیلِ نفسی میں اقدارِ مشترک کا بھی قائل ہے۔ اُس نے فرائڈ کے لاشعور، طفلی جنسیّت، نفسیاتی دباؤ اور ایڈیپس کی اُلجھن ــــ صِغرسنی سے بیٹی کی باپ سے اور بیٹے کی ماں سے جنسی محبت ــــ کو رد کر دیا اور فرائڈ کے اِس دعوے پر بھی صاد نہیں کیا کہ نفسیاتی دباؤ، لاشعوری مزاحمت اور نفسیاتی کشمکش کو پیشِ نظر رکھے بغیر فتورِ ذہن کی تشخیص اور علاج ممکن نہیں ہے۔ ژنگ نے ادھیڑ عمر کے لوگوں کی نفسیات پر قابلِ قدر کام کیا ہے اور انہیں تکمیلِ ذات کی دعوت دی ہے۔ وہ کہتا ہے جس طرح پارس تانبے کو سونے میں بدل دیتا ہے اِسی طرح تکمیلِ ذات اِنسان کے ذہن و قلب سے کھوٹ کپٹ کو دُور کر کے اُس کی شخصیت کو کُندن بنا دیتی ہے۔ فرائڈ نے نفسِ اِنسانی کی تقسیم یوں کی تھی (۱) ــــ شعور (۲) ــــ ماقبل شعور یا تحت شعور (۳) ــــ لاشعور۔ ژنگ اجتماعی لاشعور کو اہم سمجھتا ہے۔ اُس کے خیال میں اجتماعی لاشعور کے موضوعات اصل عنوان ہیں جن کا اظہار لوک کہانیوں اور دیو مالائی قِصّوں میں ہوتا ہے۔

الفریڈ ایڈلر نے کہتری کی اُلجھن کو اِنسان کے فتورِ ذہن کا سب سے بڑا سبب قرار دیا اور فرائڈ کے جنسیاتی مفروضات کو رد کر دیا اِس ضمن میں اُس کی تحقیقات نے تعلیم و تربیت پر گہرے اثرات ثبت کئے ہیں اور معلّمین نے اُس کے اِنکشافات سے بہت کچھ اِستفادہ کیا ہے۔

فرائڈ کا ایک اِنقلابی انکشاف طفلی جنسیات کا ہے۔ اُس سے پہلے عام عقیدہ یہ تھا کہ بچے کی کوئی جنسی زندگی نہیں ہوتی۔ اُس نے ثابت کیا کہ بچہ ماں کا دودھ پیتے وقت بھوک کے ساتھ ساتھ جنسی خواہش کی تشفّی بھی کرتا ہے شہوانی توانائی (لبائڈو۔ بعد میں فرائڈ نے اِس کے تصوّر کو وسعت دے کر اِسے ایراس کا نام دیا تھا) پیدائش کے وقت بچے کے جسم کے مختلف اعضاء

میں منتشر ہوتی ہے لیکن دودھ پیتے وقت ہونٹ اِس کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اُس کے خیال میں ایڈپس
کی اُلجھن اور ختنہ کی اُلجھن ـــ یہ اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب ماں باپ بچے کو اپنے عضوِ خاص سے
کھیلنے سے سختی سے منع کرتے ہیں اور اُسے کاٹ دینے کی دھمکی دیتے ہیں، لڑکیوں میں یہ اُلجھن اِس
احساس سے نمود پذیر ہوتی ہے کہ اُن کا عضوِ خاص کاٹ دیا گیا ہے ـــ ہماری نفسیاتی زندگی پر دور
رس اثرات ثبت کرتی ہے۔ فرائڈ کی خوابوں کی ترجمانی بھی اُس کی قابلِ قدر دین ہے۔ اُس نے بے شمار
خوابوں کے تجزیے کر کے ثابت کیا ہے کہ ہم اپنے خوابوں میں اپنی ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کرتے ہیں۔

فرائڈ کے نظریّے کو سائنٹفک کہا جاتا ہے لیکن یہ بات صرف ایک حد تک درست ہے۔ اُس
نے ایڈپس کی اُلجھن کو تحلیلِ نفسی کا مرکز و محور قرار دیا ہے لیکن یہ محض ایک مفروضہ ہے۔ میلی نوسکی نے
ثابت کیا ہے کہ جن وحشی قبائل میں مادری نظامِ معاشرہ قائم ہے یعنی جہاں عورت کو مرد پر سیادت
حاصل ہے وہاں ایڈپس کی اُلجھن کے نمود پذیر ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا کیوں کہ بیٹے باپ
کو کوئی اہمیت نہیں دیتے مزید براں فرائڈ کے یہاں دُوئی کار فرما ہے: اَنا اور اِڈ، اصولِ حقیقت
اور اصولِ حظ، حیات کی جبلت اور مرگ کی جبلت، ایراس اور تھانے ٹاس (موت) وغیرہ۔ اِس
لئے اُس کے اِن کے افکار کو مابعد النفسیاتی کہا جا سکتا ہے۔ فرائڈ کے پیرووں ایرک فروم، کرن ہورنی
وغیرہ نے اِن مفروضات میں بہت کچھ ترمیم کر لی ہے۔ فی زمانہ اُس کی ہمہ جنسیت، ایڈپس اُلجھن، موت
کی جبلت، جبریت، قنوطیت اور خرد دشمنی کے بارے میں اہلِ علم مُتردّد ہیں لیکن طفلی جنسیات،
نفسیاتی دباؤ، ذہنی کشمکش اور خوابوں کی ترجمانی کے بارے میں فرائڈ کی تحقیقات کو ہمیشہ قدر و منزلت
کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اُس کے افکار نے معاصر فن و ادب پر گہرے اثرات ثبت کئے ہیں
اور قصوں میں شعوری رَو کے اسلوب کو رواج دیا ہے جس کی جھلک ہمیں مارسل، پروست، جیمز جائس
ورجینیا وولف کے قصوں میں دکھائی دیتی ہے۔

تجربیت

فلسفے کا ایک مکتب جس میں فلسفے میں سائنسی نقطۂ نظر اور طرزِ تحقیق کو رواج دینے کی کوشش

کی گئی ہے۔ اِس کے بہترین اصول سٹوارٹ مِل کی کتاب "منطق" میں ملتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ صحیح علم کے حصول کے لیئے صحیح وسائل کا اختیار کرنا ضروری ہے اور یہ صحیح وسائل ہمیں سائنس ہی فراہم کر سکتی ہے۔ تجربیت ذہنی واردات کے ربط و تعلق پر مبنی ہے مثلاً بچہ جانتا ہے کہ آگ جلاتی ہے کیوں کہ اُس کے تجربے میں جلنے اور جلانے کا عمل بہ یک وقت ظہور میں آتے ہیں۔ تجربیت پسند اخلاقیات میں اِفادیت کے قائل ہیں جیریمی بنتھم کی طرح "زیادہ سے زیادہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ مسرت" بہم پہنچانے کو اخلاقیات کا نصب العین مانتے ہیں لیکن اس اِفادیت میں ایک خامی یہ ہے کہ جب ہر قانون ساز اپنی ہی لذت اور مسرت کی جستجو میں سرگرم ہوگا تو وہ دوسروں کی لذت یا مسرت کے لیئے قوانین کیسے بنا سکے گا اور افراد کی مسرتیں ایک جگہ اکھٹی کیسے ہوں گی۔ بعض نئے مکاتب فلسفہ مثلاً منطقی تحلیل، نو حقیقت پسندی اور منطقی ایجابیت وغیرہ تجربیت ہی کی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔

تختت کی رات

شبِ عروسی۔ اِسے سہاگ رات اور شبِ زفاف بھی کہتے ہیں۔

تخلیقی عمل

یہاں فن کار کا تخلیقی عمل مراد ہے۔ خارجی اشیاء کا عکس فنکار کے تخیل پر پڑے تو تخلیقی ہیولا بنتا ہے جس میں فنکار کا تفکر قدر و معنویت پیدا کرتا ہے اور قوتِ اظہار اِسے فنی پیکر عطا کرتی ہے۔ عملِ اظہار کے تین مراحل ہیں۔ فن کار کے ذہن میں ایک عرصے تک کوئی خیال مچلتا رہتا ہے اور اس کے تخیل پر اثرانداز ہوتا رہتا ہے اور فنکار شعوری طور پر اِس پر فکر کرتا رہتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں یہ خیال خوابیدگی کی حالت میں رہتا ہے۔ آخری مرحلے میں یہی خیال فنی پیکروں کی صورت اختیار کر کے فن کار پر منکشف ہو جاتا ہے اور وہ اِسے الفاظ، رنگوں یا نغموں وغیرہ میں منتقل کر دیتا ہے۔ فن کے نفسیاتی محرکات سے بحث کرتے ہوئے فرائڈ نے کہا ہے کہ فن کار مصوری، شاعری، موسیقی وغیرہ کی صورت میں اپنی جنسی محرومیوں کی تلافی کرتے ہیں یعنی جو خواہشیں روزمرّہ کی زندگی میں ناآسودہ رہتی ہیں اُن کی تلخی سے نجات پانے کے لیئے فن ایک قسم کے نشے کا کام دیتا ہے لیکن یہ محلِ نظر ہے۔

فن کے شہ پاروں میں دوامی تاثیر کی توجیہہ محض حرماں نصیب افراد کے حوالے سے نہیں کی جا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان دوستی کا نصب العین کسی فن پارے کو بقائے دوام عطا کرتا ہے اور ظاہر ہے یہ نصب العین اپنی ترجمانی کے لئے انفرادی محرومیوں اور شخصی حدود کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ کوئی فنکار جتنا اپنی ذات کی قیود سے بلند تر ہوگا اُتنا ہی وہ عظمت کی بلندیوں کو چھو سکے گا۔

ترسُل

تین شاخوں کا عصا جو سادھو اپنے پاس رکھتے ہیں۔ یہ مردانہ اعضائے تناسلیہ کی علامت ہے جسے برکت کے لئے رکھا جاتا ہے۔

ترقی پسندی

ترقی پسندی وہ ادبی تحریک ہے جو روس کے اشتراکی انقلاب کے ساتھ اُبھری تھی اور جس کا عظیم ترجمان قصہ نویس اور تمثیل نگار گورکی تھا۔ اِس تحریک کا مقصد عوام کے سیاسی شعور کی تربیت کرنا اور انقلابی قدروں کی آبیاری کرنا ہے۔ ۱۹ ویں صدی کے فرانسیسی جمال پسندوں نے فن برائے فن کا نعرہ لگایا جس سے فن کو روزمرّہ کی زندگی سے منقطع کرنا مقصود تھا۔ بلنسکی اور لیوٹالسٹائے نے اِس نعرے پر گرفت کی اور کہا کہ ادب و فن کو چند گنے چنے بلند ابرو جمال پسندوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ عوام بھی اِس کے برکات سے فیضان پانے کے حق دار ہیں۔ ترقی پسندوں نے اسی اصول کی ترجمانی کی ہے۔ اُن کا اِدعا یہ ہے کہ کوئی سچا فنکار یا ادیب اُس انقلابی تحریک سے بے تعلق نہیں رہ سکتا جو فی زمانہ معاشی انصاف کے حصول کے لئے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں برپا ہے اور جس کا مقصد عوام کو مغربی سامراج کے چنگل اور ساہوکاروں اور صنعت کاروں کے اِستحصال سے نجات دلانا ہے۔ ترقی پسندی کی ادبی و فنی تحریک اِسی ہمہ گیر اشتراکی تحریک سے عضویاتی طور پر وابستہ ہے۔ جب ایک باشعور فن کار دیکھتا ہے کہ اُس کے مُلک کے عوام اِستحصال کی چکّی کے بے رحم پاٹوں میں پس رہے ہیں تو وہ قدرتاً اِس ظُلم سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ عوام کی محبت اور اِستحصال کرنے والوں سے نفرت اُس کے مزاجِ عقلی میں اِس طرح رچ بس جاتی ہے کہ وہ اپنے شعر و ادب میں

اِس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عوامی آرزوئیں، اُمنگوں اور وَلولوں کے ساتھ اُس کی ذہنی و ذوقی وابستگی اُس کے شعروادب کو توانائی اور بالیدگی عطا کرتی ہے۔ ترّقی پسندی کے معترضین کہتے ہیں کہ یہ تحریک مقصدی ہے اِس لئے فن کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہے گویا بالواسطہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زندگی مقصد و غائیت سے عاری ہے۔ وہ بھُول جاتے ہیں کہ ترّقی پسندی کی مخالفت کی تہ میں بھی ایک مقصد کارفرما ہے اور وہ یہ ہے کہ عوام کی اِنقلابی تحریکوں کے سامنے بند باندھ دیا جائے۔ ترّقی پسندوں اور رجعت پسندوں میں فرق محض اِس بات کا ہے کہ ترّقی پسند دیانت داری اور صاف گوئی سے کام لے کر ادب و فن میں مقصدّیت کا اعتراف کرتے ہیں جب کہ رجعت پسند اپنے عزائم اور مقاصد کو 'خالص ادب'، 'فن برائے فن' اور 'ازلی و ابدی جمالیاتی قدروں' کے لبادوں میں چھُپاتے ہیں اور خارجی احوال سے بے تعلّق ہو کر اپنے ہی من میں غواصی کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اِسی موضوعیت اور داخلیت نے مغرب کے ادب و شعر کو تنزل پذیری کی راہ پر ڈال دیا ہے۔

تصوّف

تصوّف کا لغوی معنیٰ ہے اُس نے صُوف کا لباس پہنا۔ صُوف اُونی کھادی کو کہتے تھے جس کا کھُردرا لباس عیسائیوں کے راہب پہنا کرتے تھے۔ اُن کی تقلید میں مسلمان زُہّاد بھی اِسی کھادی کا خرقہ پہننے لگے۔ سب سے پہلے ابو ہاشم کوفی کو صُوفی کہہ کر پکارا گیا (۷۶۰ء)۔ تصوّف کی نشوونما خراسان میں ہوئی تھی جو بدھ مت کا بڑا مرکز رہا تھا چنانچہ خراسان کے صوفیہ زاویہ نشینی اور ترکِ دُنیا پر زور دیتے تھے۔ ان میں ابراہیم بن ادہم، شفیق بلخی، عبداللہ بن مبارک، احمد بن فرزویہ، ابوعلی صادق بلخی اور ابوالحسن نوری خراسانی نے شہرت پائی۔ یحیٰی بن معاذ بلخی کے یہاں حسنِ ازل اور عشقِ حقیقی کا تصوّر ملتا ہے۔ ابوالحسن نوُری نے کہا کہ خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کشف و اشراق ضروری ہے۔ ابو بکر شبلی خراسانی کا قول ہے کہ حبسِ دم سے دل پاک ہو جاتا ہے۔ ابو سلیمان الدارانی کہتے تھے کہ اللہ کا وصل صرف مستی اور وجد و حال ہی سے میسّر آ سکتا ہے۔

معروف کرخی رہبانیت میں غلو کرتے تھے۔ انہیں محمورِ الوہیت کہا جاتا تھا۔ خراسان سے عراق اور مصر میں تصوّف کی اشاعت ہوئی۔ اکثر صُوفیہ عجمی تھے۔ حارث بن اسد المحاسبی کے شاگرد جنید بغدادی نے کہا کہ از خود رفتگی الہامی ہوتی ہے جس میں محبوبِ ازلی سے بلا واسطہ ربط ضبط پیدا ہو جاتا ہے۔ ذُوالنّون مصری کہا کرتے تھے کہ اللہ کا وصال صرف وارفتگی کے عالم میں ارزانی ہوتا ہے۔ رابعہ بصری نے محبوبِ حقیقی کے عشق میں پُرجوش اشعار لکھے۔ بایزید بسطامی صاحبِ حال تھے۔ اُن کا قول ہے "خُدا مَیں ہوں، میرا جلال کیسا عظیم ہے"۔ انہوں نے تصوّف میں فنا کا تصوّر داخل کیا جو صریحاً بودھوں کے نروان ہی کی صورت ہے۔ الحاکم ترمذی نے کہا کہ اولیاء کے پاس بھی ایسی ہی مُہر (خاتم) ہوتی ہے جیسی کہ انبیاء کی۔ یہ خیال شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے انہی سے اخذ کیا تھا اور اپنے آپ کو خاتم الاولیاء کہا تھا۔ عجمی صُوفیوں میں حبیب عجمی اور منصور حلاّج نے شہرت پائی۔ حلاّج نے حلول، تناسخ ارواح اور اوتار کے تصوّرات تصوّف میں داخل کئے اور کہا کہ ہُوہُو (یُونانیوں کا لوگس) خلق آدم سے پہلے موجود تھا اور یہی کائنات کی تکوین کا اصول اوّل ہے۔ ابن عربی نے حلاّج کے ہُوہُو کو انسانِ کامل اور حقیقتِ محمدّیہ کے نام دیئے۔ ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود کے اساسی افکار یہ ہیں: وجود بالذّات حق تعالےٰ ہے، ماسوا اللہ کا وجود بالغرض ہے۔ وجود عین ذاتِ حق ہے، اعیانِ ثابتہ وہ معلومات ہیں جو حق تعالیٰ کے ذہن میں ہیں اور جو مادی اشیاء کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، کوئی شے عدم سے وجود میں نہیں آسکتی، اِنسان مجبورِ محض ہے۔ ابن عربی کے افکار کو صدر الدین قونوی، عبدالکریم الجیلی، عراقی، ابن الفارض اور مولوی رومی نے جوش و خروش سے پھیلایا۔ مرورِ زمانہ سے تصوّف جو اصلاحِ اخلاق کی ایک تحریک تھی فلسفے کی شکل اختیار کر گئی اور اِس میں اشراق، حلول، سریان، تجلیّ اور فصل و جذب کے نوفلاطونی افکار نفوذ کر گئے۔

بارھویں صدی عیسوی میں صُوفیہ کے فرقے نمودار ہوئے۔ اِن میں قادرّیہ، سہروردّیہ، چشتیّہ، شاذلیّہ، مولویّہ، شطاریّہ اور نقش بندیہ مشہور ہوئے۔ صُوفیہ نے دُنیائے اِسلام میں ہر کہیں اپنی خانقاہیں اور زاویے قائم کئے اور پیری مُریدی کا سلسلہ محکم کیا۔ ایک مدت سے تصوف کی یہ تحریک زوال پذیر ہو چکی ہے۔

صوفیہ کے ابتدائی حالات، ابونصر سراج کی کتاب اللمعہ اور ابوطالب مکی کی قوت القلوب وغیرہ میں ملتے ہیں۔ ابوعبدالرحمٰن سلمی نے طبقات الصوفیہ لکھی جسے سامنے رکھ کر عبداللہ انصاری نے فارسی میں صوفیہ کے سوانح لکھے۔ جامی نے نفحات الانس میں عبداللہ انصاری سے استفادہ کیا ہے۔ اصفہانی کی حلیۃ الاولیاء، ابوالقاسم القشیری اور علی ہجویری کی کشف المحجوب سے بھی خاصی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

تقدیر

تقدیر کا معنی ہے اندازہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے جو کچھ اس دنیا میں کرنا ہے اُس کا پہلے ہی سے تعین کر دیا گیا ہے۔ یونانی اسے موئرا، عیسائی ازلی گناہ، مجوسی زروان، ہندو کرم اور مسلمان قسمت کہتے ہیں۔ یہ سراسر جبریت کا تصور ہے۔ اس کی رو سے انسان بے بس اور مجبور محض ہے۔ وہ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے اپنی قسمت کو بدل نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قسمت اور کرم کے نام پر انسان اپنے جرائم اور بداعمالیوں کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ وہ بڑے سے بڑا جرم کرنے کے بعد بھی اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتا ہے کہ میری تقدیر میں ہی لکھا تھا میں کیا کر سکتا تھا۔ جبر کے اس تصور نے سادہ لوح محنت کش عوام کو بھی اپنے حقوق کی طلب سے باز رکھا ہے۔ انہیں یہ بات ذہن نشین کرا دی گئی ہے کہ غربت اور احتیاج اُن کے نوشتۂ تقدیر میں ہے اس لئے اس پر قناعت کرنا ہی قرینِ مصلحت ہوگا۔ جدید سائنس کے فروغ اور اُس کی درخشاں کامیابیوں نے انسان کو اس سلبی تصور سے نجات دلائی ہے اور وہ فطرت کی تسخیر کے ساتھ ساتھ اپنے معاشرتی اور اقتصادی ماحول کو بدلنے پر بھی کمربستہ ہو گیا ہے۔

تشکک

فلسفے کا ایک مکتب جس کا اصل اصول یہ ہے کہ ہم کسی مسئلے کے بارے میں کوئی حتمی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے نہ کوئی قطعی رائے قائم کر سکتے ہیں کیوں کہ تمام دلائل ایک دوسرے کی نفی کر دیتے ہیں۔ اس کا مشہور شارح پرہو تھا۔ جب وہ مر گیا تو اُس کے شاگرد میت کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے۔ کسی نے پوچھا تم لوگ اپنے اُستاد کی تدفین کا سامان کیوں نہیں کرتے۔ وہ بولے "ہمیں اس بات کا یقین نہیں

ہے کہ وہ مر گیا ہے۔"

تکوین

کائنات کی تکوین کے بارے میں مختلف دیو مالائی روایات ہیں۔

— سُمیریا : خُدا نے ایک کلمہ کہا اور کائنات معرضِ وجود میں آ گئی۔

— مِصر : خُدا نے کائنات کو چرخے پر سُوت کی طرح کاتا۔ ایک اور روایت کے مطابق خُدا نے کائنات کو یوں بنایا جیسے ایک کُمہار چاک پر برتن بناتا ہے۔

— بابل : بعل مردوک نے مادہ اژدھا تیامت کو قتل کر کے اُس کے دو ٹکڑے کیے، ایک سے آسمان اور دوسرے سے زمین بنائی۔

— یُونان : پہلے پہل اتھاہ تاریکی تھی۔ اِس سے عشق پیدا ہوا جس کے ساتھ کائنات وجود میں آئی۔ پہلی مخلوق آسمانی باپ (یورے نس) اور دھرتی ماتا جیا کے بچے تھے۔

— ہند : شیو کی مرشت کے نسوانی پہلو سے شکتی پیدا ہوئی جو اُس کی زوجہ بن گئی۔ بعد میں یہی شکتی ازلی اصولِ تخلیق قرار پائی جو پُرش سے واصل ہوئی اور یہ کائنات بنی۔ ایک اور روایت کے مطابق پرکرتی (مادہ) اور پُرش کے اختلاط سے کائنات بنی تھی۔

— پولی نیشیا : کائنات ایک انڈے سے نمودار ہوئی تھی۔

تعلیم

بچوں کی تعلیم کو تکونی عمل کہا گیا ہے جس میں بچہ، نصاب اور اُستاد شامل ہیں۔ پہلے پہل فیثا غورس، افلاطون اور ارسطو نے تعلیم کے اصول مُرتّب کیے تھے جن پر فروبل، پستالاتسی، مونٹے سوری اور ایڈلر نے قابلِ قدر اضافہ کیا۔ افلاطون نے کہا کہ تعلیم کا مقصد بچے کی جسمانی، ذہنی اور ذوقی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا ہے تاکہ بالغ ہو کر وہ اپنے مُلک کا اچھا شہری بن سکے۔ اِس مقصد کے لیے اُس نے جمناسٹک، موسیقی اور ریاضی کی تعلیم پر زور دیا۔ وہ بچوں کو عشقیہ نظمیں پڑھانے کے حق میں نہیں تھا اور کہتا تھا کہ اِن سے جذباتی ہیجان پیدا ہوتا ہے جو اُن کی فکری نشوونما میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ نصاب مُرتّب کرتے

وقت اِس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہمارے پیشِ نظر مقصد کیا ہے۔ سپارٹا والے اپنے بچوں کو جنگ جُو بنانا چاہتے تھے اِس لئے اُن کے نصابِ تعلیم میں جسمانی ورزش اور جفاکشی پر زور دیا گیا تھا۔ وہ لڑکوں کو اپنے ماں باپ سے الگ تھلگ بارکوں میں رکھتے تھے اور اُن میں شجاعت اور ثابت قدمی کے اوصاف پیدا کرتے تھے۔ افلاطون بھی اُن کے نصابِ تعلیم سے مُتاثر ہوا تھا۔ جدید دَور میں سائنس اور خاص طور سے نفسیات کے انکشافات کی روشنی میں نصاب مُرتّب کرنے پر زور دیا گیا۔ فروبل، پستالالسی اور مونٹے سوری نے بچوں کو پھُولوں سے تشبیہہ دی ہے اور کہا ہے کہ پیار محبت ہی سے اُن کی صحیح نشوونما ہو سکتی ہے چنانچہ اب مدرسوں کو کنڈر گارٹن (بچوں کے باغ) کہا جاتا ہے اور ننھے بچوں کو کھیل کھیل میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اُستادوں کی تربیت میں اُنہیں فلسفۂ تعلیم کے ساتھ ساتھ نفسیاتِ تعلیم بھی پڑھائی جاتی ہے جس سے وہ بچوں اور نوجوانوں کی نفسیات سے باخبر ہو جاتے ہیں، مناسب طریقے سے اُن کی شخصیت اور کردار کی تشکیل کرتے ہیں اور اُن کی ذہنی و جذباتی مشکلات کو دُور کرتے ہیں۔ آج کل نصاب کو مُرتّب کرتے وقت سائنس کی تدریس کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ بچوں میں تحقیقِ علمی کا شوق پیدا ہو اور وہ اُن توہّمات سے محفوظ رہ سکیں جنھوں نے صدیوں سے ذہنِ انسانی کو پراگندہ کر رکھا ہے۔ نظری و تجرباتی سائنس کی تدریس کے بغیر صنعتی معاشرے کے سیاسی، معاشی اور عمرانی تقاضوں کو پُورا کرنا ممکن نہیں ہے۔

تلسی

ناز بُو کا پودا جو ہندوؤں کے ہاں مُقدّس ہے۔ یہ پودا قدامت پسند ہندوؤں کے گھروں میں اُگایا جاتا ہے اور اِسے دیوی سمجھ کر اِس کی پُوجا کی جاتی ہے۔ رات کو اِس کے آگے چراغ روشن کر کے اِس کا پرکما کرتے ہیں۔ مرتے وقت اِس کا پتہ مُنہ میں رکھتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق تلسی ایک خوبصورت دوشیزہ تھی جس پر کرشن جی عاشق ہو گئے، اِسے پودے میں بدل دیا اور اِس کی پُوجا کا حُکم دیا۔ تلسی کو سیتا کا اوتار بھی کہا جاتا ہے۔ لوگ آفات سے بچنے کے لئے اُس کے منکوں کی مالا پہنتے ہیں۔

تمباکو

۱۵۵۸ء میں تمباکو پہلی بار امریکہ سے ہسپانیہ لایا گیا۔ پرتگال میں فرانس کا سفیر نکوٹ تھا جس نے تمباکو کے کچھ بیج سوغات کے طور پر ملکۂ فرانس کیتھرین دیمیچی کو بھیجے۔ نکوٹ کے نام پر تمباکو کے پودوں کو نکوٹین کہا جانے لگا۔ تمباکو کے پودوں میں زہریلے مادے کو اسی کے نام پر نکوٹین کہا گیا۔ کلیسائے یونان میں تمباکو کو منشیات میں شمار کیا گیا ہے اور اس میں تمباکو نوشی ممنوع ہے۔

تمغہ

(۱) تمغہ ترکی زبان میں شاہی مہر کو کہتے ہیں (۲) ایک محصول جو منگول تجارت پر لگاتے تھے۔

تنترمت

تنتر کا لغوی معنی ہے وسیلہ۔ یہ رسالے شیو اور اُس کی زوجہ شکتی کے مکالمات پر مشتمل ہیں جن میں شیو اُس کے سوالات کے جواب دیتا ہے۔ تنتروں میں شکتی پوجا کے رسوم و آداب کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ تنترمت والے شکتی کی پوجا کے دوران میں جنسی بے راہ روی کے مظاہرے کرتے ہیں۔

توہمات

توہم اُس عقیدے یا عمل کو کہتے ہیں جو نامعلوم اور پُراسرار کے خوف پر مبنی ہو اور جس کی کوئی علمی توجیہہ نہ کی جا سکے۔ توہمات اکثر و بیشتر جادو، نظرِ بد، غیب بینی اور سعد و نحس سے وابستہ رہے ہیں اور قدیم انسان کی اُن ذہنی کاوشوں سے یادگار ہیں جب وہ سبب و مسبّب کے قانون ــــ ہر مسبّب کا لازماً ایک سبب ہوتا ہے ــــ سے بے خبر تھا اور قدرتی مظاہر اور غیر معمولی واقعات کی توجیہہ طفلانہ قیاس آرائیوں سے کیا کرتا تھا۔ اُسے اپنے چاروں طرف ہر شئے پُراسرار دکھائی دیتی تھی۔ وہ سورج اور چاند کے طلوع و غروب، تاروں کی ٹمٹماہٹ، بادلوں کی گرج چمک، دریاؤں اور سمندروں کی موجزنی، پہاڑوں کی سربلندی، پیڑوں کے جھومنے اور پھولوں کے لہلہانے اور ان جیسے دوسرے فطرتی مناظر کو سمجھنے سے قاصر تھا اور ان کے بارے میں قیاس آرائیوں سے کام لیتا تھا۔ انہی قیاس آرائیوں سے قدیم مذہب اور جادو کا آغاز ہوا۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ انسان کا خوف حیرت اور

بجنس ہی بدل گیا تو سائنس کی بُنیاد پڑی، علمی تحقیق سے اسرار کے پردے اُٹھنے لگے اور انسان نے فطرت سے خوفزدہ ہونے کے بجائے اُس کی تسخیر پر کمر ہمت باندھی. سائنس کے فروغ کے ساتھ ساتھ توہمات کی بُنیادیں متزلزل ہو گئیں لیکن سائنس کی ترقی کے باوصف آج بھی ایک حد تک انسانی ذہن و قلب پر توہمات کا تصرّف باقی ہے اور جہلاء سے قطع نظر بعض اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی بھی اِن کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فال گیروں، نجومیوں، عاملوں، پیروں، یوگیوں، رشیوں اور دست شناسوں وغیرہ کا کاروبار زوروں پر ہے۔ آج بھی لوگ ۱۳ کے ہندسے، آئینہ ٹوٹ جانے، کالی بلّی کے رستہ کاٹنے، نمک کے گر جانے، آنکھ پھڑکنے اور اُلّو کے بولنے سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں ؛ ۳، ۵، ۷ اور ۱۲ کے اعداد کو سعد مانتے ہیں، مریخ، چاند اور زحل کو نحس اور شمس اور زُہرہ کو سعد کہا جاتا ہے، سُرخ اور زرد رنگ کو مبارک اور نیلے اور سیاہ رنگوں کو منحوس سمجھتے ہیں، بھوتوں پریتوں، چڑیلوں، عفریتوں پر عقیدہ رکھتے ہیں، قبروں پر اُگے ہوئے درختوں کی ٹہنیوں سے سُرخ رنگ کے دھاگے باندھ کر مُرادیں مانگتے ہیں۔ مغرب میں حاضرات ارواح کا چکّر "رُوحانیت" کے نام پر چلایا جا رہا ہے اور اِسے سائنٹیفک ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ رُوحانی نشست یا بیٹھک میں واسطہ بننے والی عورت وجد و حال کے عالم میں ناظرین کو مُردہ عزیزوں کی شکلیں دکھاتی ہے یا آواز سُنواتی ہے اور سادہ لوح لوگ اِن سمعی و بصری واہموں کو حقیقت مان لیتے ہیں، بلور میں گھور کر پیش گوئیاں کی جاتی ہیں اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ بلور میں ماضی کے سارے واقعات دیکھے جا سکتے ہیں۔ "رُوحانیت" کے نام پر اِس عقیدے کا پرچار کیا جا رہا ہے کہ کچھ لوگوں کے قبضے میں ایسی خفیہ اور غیر مرئی قوتیں بھی ہیں جو سائنس کے احاطۂ تحقیق سے آزاد ہیں بالاتر ہیں۔ بعض مکّار طالع آزما جو نفسیات کے مبادیات سے بھی بے بہرہ ہیں ماوراء النفسیات اور کشف و اشراق کے نام پر اپنا اُلّو سیدھا کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے یوگی اور مہارشی "سائنٹفک یوگا" کا چکّر چلا کر لاکھوں کما رہے ہیں۔ اِن لوگوں نے یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں گیان دھیان کے مرکز قائم کر رکھے ہیں۔ مہیش یوگی اور گورو مہاراج جی جیسے متفنی یوگا

اور ویدانت سے "رُوحانی امراض" کا علاج کر رہے ہیں اور لاکھوں میں نوٹ رہے ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اہلِ مغرب کے مزاجِ عقلی میں نفوذ نہیں کر سکی ۔ اُنہوں نے سائنس کو اپنے معاشی مفادات کی پرورش کا محض ایک وسیلہ بنا رکھا ہے ۔ اِس کے برعکس اِشتراکی معاشرے میں سائنس ایجاد و انکشاف تک محدود نہیں رہی بلکہ عوام کی سوچ اور احساس میں نفوذ کر چکی ہے ، اُن کا طرزِ فکر بن چکی ہے یہی وجہ ہے کہ مہارشی ، یوگی ، فال گیر اور رُوحانیت کا پرچار کرنے والے اِشتراکی ممالک کا رُخ نہیں کرتے اور سیدھے امریکہ اور یورپ میں جا کر اپنا جال پھیلاتے ہیں ۔

تھال

پنجابی دیہات میں لڑکیوں کا کھیل ہے جس میں وہ گیت گا کر گیند کھیلتی ہیں ۔

تہذیب و تمدّن

تہذیب کا معنیٰ ہے 'سنوارنا' اور تمدّن کا مطلب ہے شہری زندگی گذارنا ۔ تہذیب کے لئے انگریزی کا لفظ کلچر اور جرمن کا لفظ کلٹر ہے دونوں کا معنیٰ ہے کھودنا ، پیدا کرنا ، اُگانا ۔ لفظ تہذیب کئی معنوں میں مستعمل ہے (۱) علم الانسان اصطلاح میں جو کام بھی انسان نے بر حیثیت انسان کے کیا ہے وہ تہذیب یا کلچر کے ضمن میں آئے گا (۲) کسی خاص قوم کی ذہنی اور ذوقی ترقی اُس مُلک کی تہذیب کی نشان دہی کرتی ہے (۳) فرد کی نسبت سے تہذیبِ نفس کا مطلب ہو گا شائستگی ، ادبی و علمی ذوق ، انسانی ہمدردی اور مُروّت ، کسی اعلیٰ نصب العین پر عقیدہ رکھنا اور اُس کی مُتعلقہ قدروں کی آبیاری کرنا ۔ بعض عُلماء کے خیال میں تمدّن تہذیب ہی میں مشمول ہے اُس سے الگ نہیں ہے ۔ عام طور سے کسی قوم کے علمی ، فنّی اور فکری کارناموں کو اُس کی تہذیب اور مادی ترقی کو اُس کے تمدّن سے منسوب کیا جاتا ہے ۔

تھگّڑ پیر

کسی ولی کے مزار کے درخت کو تھگّڑ پیر کہتے ہیں ۔ اس پر عورتیں منّت کی دھجیاں لٹکاتی ہیں ۔ تھگّڑ کپڑے کو کہتے ہیں ۔

تیرتھ

تیرتھ اصل میں کسی جھیل یا دریا کے کنارے کی نہانے کی جگہ کو کہتے تھے بعد میں زیارت گاہ کے معنوں میں آیا۔ بنارس، الہ آباد، کوروکھشیتر، پُشکر، کنّاس، گیا ہندوؤں کے مشہور تیرتھ ہیں۔ ہر سال سیکڑوں امیر کبیر ہندو مرنے کے لئے بنارس آتے ہیں اور برہمنوں کو لاکھوں روپے دان کرتے ہیں۔ گیا میں عورتیں سر کے بال مونڈ کر بھینٹ کرتی ہیں گویا وہ اپنے سر کی قربانی دے رہی ہیں۔ یہ مقامات لاکھوں طفیل خوار برہمنوں کی عیاشی کے اڈّے بن گئے ہیں۔

تیرہ تالن

گانے اور ناچنے والیوں کا طائفہ جنہیں ابو الفضل نے آئینِ اکبری میں سیزدہ تالی (تیرہ تالن) کہا ہے۔ یہ عورتیں گاتے اور ناچتے وقت تیرہ تالوں سے کام لیتی تھیں جو اُن کے زیورات میں لگے ہوئے گھنگروؤں سے بجتی تھیں جو دو کلائیوں پر، دو دو کہنیوں پر، دو دو کندھوں پر، ایک چھاتی پر اور دو ہاتھوں کی انگلیوں میں پہنے جاتے تھے۔ اِن کا تعلق عام طور سے گجرات کاٹھیاواڑ اور مالوہ سے ہوتا تھا۔ پنجابی میں چالاک اور عیّار عورت کو تیرہ تالن کہتے ہیں۔

تین گُن

ہندومت کی رُو سے تین گُن (اوصاف) کائنات کی ہر شے میں سرایت کئے ہوئے ہیں، ستوگن (صداقت) وشنو سے تموگن (جوشِ غضب) شیو سے اور رجوگن (خواہش جس نے کائنات کو پیدا کیا) برہما سے متعلق ہے۔ انہیں ست، تمؔ اور رَج بھی کہا جاتا ہے۔

تورۂ چنگیزی

مغلوں کے اِس قانون کی رُو سے وہ عورت جس پر بادشاہ خواہش کی نظر کرتا تھا اپنے شوہر پر حرام ہو جاتی تھی اور وہ اُسے آراستہ کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیتا تھا۔ شاہانِ بُخارا اس قانون کے تحت رعایہ کی حسین و جمیل عورتوں کو اپنے حرم میں داخل کر لیا کرتے تھے۔ رُوسیوں نے تُرکستان پر قبضہ کیا تو اِس رسم کا اِنسداد کر دیا۔

ترسا

فارسی والے عیسائیوں کو ترسا کہتے تھے جس کا معنیٰ ہے (خدا سے) ڈرنے والا۔

تاجیک

ترک ایرانیوں کو تاجیک کہتے تھے۔ ایرانی عربوں کو تازیک یا تازی کہنے لگے۔

ترک

لفظ ترک کا لغوی معنیٰ ہے "قوت، توانائی، خود"۔

تنگری

منگولوں کا خداوندِ آسمان جس سے وہ دشمن کے واسطے سے استمداد کرتے تھے۔

ٹپہ

پنجاب کی لوک شاعری میں ماہیے کا بول ٹپہ کہلاتا ہے۔ موسیقی کی اصطلاح میں گیت جسے پنجاب کے ساربان گاتے ہیں جنہیں میاں شوری لکھنؤ لے گیا جہاں اسے اُستادی موسیقی میں شامل کرلیا گیا۔ اس میں گٹکری اور مرکی کا لطیف امتزاج ہوا ہے۔ فی زمانہ یہ صنف متروک ہو چکی ہے۔

ٹکسلا

راولپنڈی کے نواح میں ایک قدیم شہر تھا جس کا اصل نام تکشاشیلا تھا۔ اسے ٹکا قبیلے نے بسایا تھا جس کا فرد راجہ پورس تھا۔ اب اس کے کھنڈر دُور تک پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں تین ملحقہ شہروں کے آثار دریافت کئے گئے ہیں۔ بھڑ، سرکپ اور سرسکھ۔ قیاس یہ ہے کہ بھڑ کا شہر ایران کے ہنخامنشی فاتحین نے آباد کیا تھا۔ صدیوں تک یہاں بودھوں کی درس گاہیں کھلی رہیں جہاں تعلیم پانے کیلئے دُور دراز کے ممالک سے طلبہ آتے تھے۔ اشوک کا مشہور ستوپا دھرم راجیکا یہیں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس شہر پر ایک صدی تک باختری یونانیوں نے حکومت کی پھر ساکا، پارتھیوں اور کشانوں نے یکے بعد دیگرے اسے فتح کیا۔ باختری یونانیوں سے سرکپ کا شہر اور جنڈیال کا معبد یادگار ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں سفید ہنوں نے ٹکسلا کو فتح کرکے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ٹوبھا

پنجابی دیہات کے غوطہ خور جو کنواں کھودنے کے بعد غوطے لگا کر پانی کی سوتیں درست کرتے ہیں۔

ٹھگی

۱۹ ویں صدی کے اوائل میں ٹھگ ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اِن میں ہندو

مسلمان بھی شامل تھے۔ یہ قاتلوں کی ایک خفیہ تنظیم تھی جس میں کالی دیوی کو سرپرست مانا جاتا تھا۔ کالی کے مت میں خون بہانا مباح ہے اس لئے یہ لوگ مسافروں کو لوٹنے سے پہلے انہیں دھوکا دے کر قتل کر دیتے تھے۔ ان کا طریقۂ واردات یہ تھا کہ کسی کھاتے پیتے مسافر کی ہمراہی میں سفر کرتے تھے اور راستے میں اُس سے دوستی جتاتے تھے۔ موقع پر یہ مسافر کو کھانے میں کوئی نشہ آور دوا کھلا دیتے اور پھر اُس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالتے تھے۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنا رومال کام میں لاتے تھے۔ انگریز کمپنی نے اِن کے انسداد کی مہم چلائی اور کرنل سلیمن نے اِن کا استیصال کر کے مُلک کو اِس لعنت سے نجات دلائی۔ بنارسی ٹھگ خاص طور سے خطرناک لحاظ کیے جاتے تھے۔

ٹھُمری

ٹھمری ہلکی پھلکی گائیکی کی ایک صورت ہے جو لکھنو اور بنارس میں پروان چڑھی۔ اس گائیکی کے تین اسالیب ہیں۔ لکھنوی، بنارسی اور پنجابی۔ لکھنوی اسلوب کا مُوجد صادق علی خاں تھا۔ اس میں لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے۔ لکھنو کے قادر پیا نے مُتعدد ٹھُمریاں مُرتب کیں۔ بنارس کی ٹھمری پر چیت اور کجری جیسے لوک گیتوں کا اثر پڑا اور پنجابی ٹھُمری پہاڑی، ماھیا وغیرہ لوک گیتوں سے مُتاثر ہوئی۔ ٹھمری آسان اور عام فہم راگنیوں میں گائی جاتی ہے جو لوک گیتوں کے قریب تر ہیں مثلاً دیس، کھماج، تلک کامود، بھیرویں، جھنجھوٹی، تلنگ، پیلو وغیرہ۔ اس کے اکثر بول ہندی میں باندھے گئے ہیں جن میں عورت اپنے بچھڑے ہوئے شوہر سے یا رادھا کرشن سے شوق ملاقات کا اظہار کرتی ہے یا اُس کی بیوفائی کی شکایت کرتی ہے۔

ٹھیپا

ہندوؤں کا ایک توہم ہے کہ جب کسی شخص کی زوجہ مر جاتی ہے اور وہ دوسرا بیاہ کر لیتا ہے تو پہلی زوجہ کا پریت دوسری عورت کو ستانے لگتا ہے اور اُس کے در پئے آزار رہتا ہے۔ اس کے آزار سے بچنے کے لئے دوسری عورت پہلی عورت کا چھوٹا سا چاندی کا ٹھیپا یا بُت بنوا کر اپنے گلے میں پہن لیتی ہے۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھتی ہے تو پہلے اس ٹھیپے کو نوالے پیش کرتی ہے تاکہ وہ خوش ہو جائے۔ اس کے بعد خود کھاتی ہے۔ اُس کے خیال میں ایسا کرنے سے پہلی عورت کا پریت اُسے ستانا چھوڑ دیتا ہے۔

ٹھیرا : بوڑھوں کے عمر رسیدہ اُستاد کو ٹھیرا کہتے ہیں۔ اسی سے ہے ٹھیرا دادا یا بزرگوں

کا علم و دانش۔ پنجابی کا بڈھا ٹھیرا۔

ٹیلی پیتھی

بغیر کسی واسطے کے دوسرے کے خیالات معلوم کر لینے یا اپنے خیالات اُس کے ذہن میں مُنتقل کرنے کو ٹیلی پیتھی کہتے ہیں۔ ٹیلی پیتھی والے کہتے ہیں کہ ایک ایسا عالم بھی ہے جو ہمارے ادراک سے ماوراء ہے اور اُس تک مُروّجہ سائنس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ ٹیلی پیتھی کا تعلق اِسی مافوق الطّبع عالم سے ہے تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ وہی قیاس درست ہوتے ہیں جن میں قیاس آرائی کرنے والے کو اپنے ایجنٹ کے ساتھ قُربِ مکانی میسّر ہو اور اُس کے ساتھ سمعی و بصری رابطہ قائم ہو۔ جہاں دونوں میں دُوری واقع ہو گی وہاں ٹیلی پیتھی کا مظاہرہ ناکام ہو جائے گا۔ امریکہ کے ایک ماہرِ نفسیات چاسٹرڈ اور روس کے ایک عالم ٹارچینوے تجربات سے ثابت کیا ہے کہ واسطے سے دُوری کی صورت میں ٹیلی پیتھی کا تجربہ ناکام رہتا ہے کیونکہ حسّی اِشارات دینے والے ایجنٹ کا رابطہ قیاس آرائی کرنے والے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ بہر صورت ٹیلی پیتھی کی صداقت کا اِثبات کسی قسم کی مافوق الطّبع قوّتوں سے رجوع لانے سے نہیں بلکہ سائنسی تجربات ہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔

ٹنکہ

چاندی کا سکہ۔ منگولی زبان کا لفظ ہے۔ منگولوں کا سِکّہ تھا جسے وہ ٹنگہ کہتے تھے۔

ٹلہ جوگیاں

پنجاب کی لوک کہانیوں میں ٹلہ جوگیاں اور گورکھ ناتھ کا بار بار ذکر آتا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے سال میں ایک مرتبہ یہاں ایک بڑا تہوار منایا جاتا تھا جس میں شرکت کے لئے ہندوستان بھر کے جوگی اکٹھے ہوتے تھے۔ بقول ابوالفضل ایک دفعہ جلال الدین اکبر بھی ٹلہ آیا تھا اور جوگیوں سے باتیں کر کے مُتاثر ہوا تھا۔ پوُرن بھگت اور ہیر رانجھا کے لوک قصوں میں ٹلہ جوگیاں کا ذکر بار بار آتا رہا ہے۔

جنرل کننگھم نے "ہندِ قدیم کا جغرافیہ" میں لکھا ہے کہ جس ٹلہ جوگیاں (ضلع جہلم) کو گورو گورکھ ناتھ کا ٹِلّہ کہتے ہیں اُس کا قدیم نام بالناتھ کا ٹلّہ تھا۔ ٹلہ ناتھ جوگیوں کا تیرتھ تھا جہاں ایک روایت کے

مطابق رانجھے نے جوگ لیا تھا پہلے پہل یہاں سورج دیوتا کی پوجا بالناتھ کے نام سے شروع ہوئی تھی پھر مچھندر ناتھ کے چیلے گورکھ ناتھ نے شیو کی پوجا کو رواج دیا جو شیو مہادیو کا اوتار تھا اور ناتھ پنتھ قائم کیا۔

یہاں ہر سال شیوراتری کا تہوار منایا جاتا تھا کسی زمانے میں ٹلہ کن پاٹے جوگیوں کا گڑھ تھا۔ ناتھ جوگیوں کے دو فرقے تھے، اوگر اور کن پاٹے۔ کن پاٹے گورکھ ناتھ کو اپنا گرو مانتے تھے۔ وہ اپنے کان پھڑوا کر ان میں مندرے ڈالتے تھے۔ گیروا لباس پہنتے تھے۔ بھیک مانگنے کے لئے ہاتھ میں کھپری رکھتے تھے گلے میں سیلی پہنتے تھے اور سنکھ (ناد) پورتے تھے۔ ناتھ پنتھ نے پنجاب کی سرزمین سے جنم لیا لیکن اس کے اثرات بنگال اور دکن تک پھیل گئے۔ ناتھ جوگیوں نے ذات پات کی تفریق کو رد کر دیا اور انسانی مساوات کا درس دیا۔ اِن میں سے اکثر جوگی عوام سے اُٹھے تھے۔ وہ جتی ستی رہتے تھے اور لوبھ (لالچ) موہ (دنیا کی کشش) کام (جنسی خواہش) کرودھ (غصہ) آہنکار (خودی) سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔ سادہ بھاشا میں پنجابی شاعری کے سب سے پہلے نمونے ملتے ہیں۔ وہ ایک ترقی یافتہ زبان تھی۔ ایک بلند پایہ شاعر چرپٹ نے اپنے کلام میں برہمنوں کا تمسخر اڑایا ہے اور سماج کی اپرادھی قدروں کو رد کیا ہے۔ جلندھری ناتھ اور چورنگی ناتھ نے عوام کے دلوں کو شعر کی زبان عطا کی۔ گورو گورکھ ناتھ کے بارہ چیلے تھے، ستنت ناتھ، رام ناتھ، بیرنگ ناتھ، دھرم ناتھ، بیراگ ناتھ، دریا ناتھ، لیک ناتھ، گنگائی ناتھ، دھجا ناتھ، جلندھری ناتھ، نیم ناتھ اور ناگ ناتھ۔ اِن سے بارہ پنتھ جوگیوں کے جاری ہوئے۔ تیرھواں پنتھ مست ناتھیہ شروع ہوا۔

مسلمانوں میں جوگیوں کا ایک پنتھ جعفریہ جوگیوں کا ہے جو جعفر پیر سے یادگار ہے۔ آج کل انہیں راول کہتے ہیں اور یہ دیہات میں آنکھوں کے آپریشن کرتے ہیں اور جن نکالتے ہیں۔ جوگی نعش کو دو زانو بٹھا کر دفن کرتے تھے یا پانی میں بہا دیتے تھے۔ پنجاب کی لوک کہانیوں میں گگا پیر بھی گورو گورکھ ناتھ سے ارادت رکھتا تھا۔ ٹلہ جوگیاں آج کل ویران پڑا ہے۔

ثنویت

ثنویت یا دُوئی۔ مجوسیت کی رُو سے کائنات میں دو اُصول کار فرما ہیں : خیر، جس کا نمائندہ اہورامزدا ہے اور شر جس کا نمائندہ اہرمن ہے۔ اِن دونوں میں ابتدائے آفرینش سے کشمکش ہو رہی ہے۔ آخری فتح خیر یا اہورامزدا ہی کی ہوگی۔ اسرائیلی مذاہب میں خدا اور شیطان کی ثنویت مجوسیت کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ چین کے تاؤمت میں یہ دوئی یانگ اور ین کی صورت میں موجود تھی۔ یانگ فعال ہے مذکر ہے، روشنی، سچائی اور حرکت کا نمائندہ ہے۔ ین تانیث، انفعالیت، تاریکی، دروغ اور جمود کی نمائندگی کرتا ہے۔ یانگ اور ین دونوں کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوتے۔ ہندوؤں میں ایشور خدائے خیر ہے اور وشواکرما اُس کا دشمن یا شیطان ہے۔ مصرِ قدیم میں اوزائرس اور سیت خیر اور شر کی علامتیں بن گئے تھے۔ اِس آفاقی دُوئی کی جڑیں غاروں کے قدیم دَور تک جا پہنچتی ہیں جب اِنسان روشنی اور اُس کے مبدء سورج کو خیر اور تاریکی کو شر کی علامت مانتا تھا۔ بعد میں روشنی اور تاریکی کی یہ دُوئی جادو، دیومالا اور مذاہب میں ہر کہیں نفوذ کر گئی۔ آج کل جب کہ مذاہب اور اُس کے ساتھ الٰہیات پر سے اعتقاد اُٹھ گیا ہے ایک نئی دُوئی کا تصوّر اُبھر کر سامنے آیا ہے : حادثے اور موقعے کی دُوئی۔ موقع خیر، سچائی، تعمیر اور ترقی کا نمائندہ اور حادثہ موت، تخریب اور شر کی علامت سمجھا جاتا ہے گویا موقع اِنسان کا خیر خواہ اور ہمدرد ہے اور حادثہ اُس کا دُشمن اور بدخواہ ہے

ج

جاتک کہانیاں

مہایان بدھ مت کی رُو سے گوتم بدھ اور بودھی ستوا انسان کی بہتری اور فلاح کے لئے بار بار جنم لیتے ہیں اور پرندوں، حیوانات وغیرہ کے قالب بھی اختیار کرتے ہیں۔ جاتک کہانیاں انہی جنموں اور تجربوں کے واردات پر مشتمل ہیں۔ ان میں پرندے اور حیوان بھی انسانوں کی طرح باتیں کرتے ہیں، انہی کی طرح سوچتے ہیں اور سیاسیات کی گتھیاں سلجھاتے ہیں۔ کلیلہ دمنہ، کتھاسرت ساگر، سنگھاسن بتیسی وغیرہ میں اس قسم کی کہانیوں کی مثالیں ملتی ہیں۔ بودھوں کی جاتک کہانیاں دنیا بھر کی ادبیات میں نفوذ کرگئیں۔ ایسپ کی کہانیوں، الف لیلہ اور ولاتی کے گیتوں میں ان کا کھوج ملتا ہے۔

جاٹ

لغات میں لفظ جاٹ کا معنیٰ ہے نسل، قبیلہ، طریقہ، قسم۔ بالوں کی لٹ اور پشم کو بھی جٹ یا جت کہتے ہیں۔ جٹادھار میں بھی یہی مفہوم ہے۔ آج کل بالائی سندھ میں ساربان یا چرواہے کو جاٹ کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے جاٹ کا اشتقاق جٹستھا سے کیا ہے جس کا معنیٰ ہے قدیم۔ جاٹوں کا شمار آدی واسیوں میں بھی کیا جاتا ہے۔ اکثر مورخین کے خیال میں جاٹ وسط ایشیا کے ایک طاقتور قبیلے جٹائی کی اولاد ہیں جس نے تیمور لنگ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ یہی جٹائی جنہیں چینی یو ،چی لکھتے تھے نقل مکان کرکے پنجاب اور سندھ میں آگئے۔ عرب حملہ آوروں کا سندھ میں جاٹوں سے مقابلہ ہوا تھا اور وہ انہیں زط کہتے تھے۔ پنجاب کے جاٹوں نے برہمنوں کی برتری کو کبھی تسلیم نہیں کیا نہ انہیں دیوتا سمجھا۔ یہ بھی جاٹوں کے غیر آریائی ہونے کی ایک دلیل ہے۔ برہمن شروع سے جاٹوں سے نفرت کرتے رہے ہیں۔ آج کل کے جاٹوں اور راجپوتوں میں نسلی پہلو سے فرق کرنا مشکل ہے البتہ تارڑ، وڑائچ، چیمے، چٹھے اور ساہی اصلاً جاٹ ہیں۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں تاریخ میں پہلی بار جاٹوں کو راجپوتوں

پر سیاسی برتری حاصل ہوئی تھی۔

جادو

جادو دو قسم کا ہے سفید یا مثبت اور کالا یا منفی۔ کالا جادو دشمنوں کو آزار پہنچانے کے لئے کیا جاتا ہے اور سفید جادو سے کالے جادو کے مُضر اثرات کا ازالہ مقصود ہوتا ہے۔ جادو کی ایک معروف قسم جادو بالمثل ہے۔ اِس کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص کو جان سے مارنا مقصود ہو تو اُس کا مٹی کا پُتلا بنا کر اور منتر پڑھ کر اُسے بہتے پانی میں رکھ دیتے ہیں۔ پُتلے کے گھُلنے کے ساتھ وہ شخص بیمار پڑ جاتا ہے اور بالآخر مر جاتا ہے۔ بعض جادوگر دشمن کا کپڑے کا پُتلا بنا کر اُس میں منتر پڑھ کر سُوئیاں چبھوتے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ مر جاتا ہے۔ اکثر ممالک میں بارش برسانے کے لئے تپتی ہوئی زمین پر پانی اُنڈیلا جاتا ہے اور توقّع کی جاتی ہے کہ اِسی طرح مینہ برسے گا۔

ٹونوں ٹوٹکوں اور تعویذوں سے نظرِ بد کا دفعیہ کیا جاتا ہے۔ کسی لڑکی کا پیار جیتنے کے لئے اُسے پانی یا شربت میں حُب کے تعویذ گھول کر پلائے جاتے ہیں۔ ہندی میں انہیں پریم گٹکے کہتے ہیں۔ عورتیں اپنے شوہروں پر قابو پانے کے لئے اُن کے سونے کے کمرے کے کسی کونے کھدرے میں تعویذ دبا دیتی ہیں۔ بانجھ عورت کسی ننھے لڑکے کو کانسی کی چھُری سے ذبح کر کے اُس کے خُون میں نہاتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ اِس بچّے کی رُوح سے وہ حاملہ ہو جائے گی۔ جادو وحشی اور پسماندہ قبائل تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ نام نہاد مُہذّب و مُتمدّن ممالک میں بھی پایا جاتا ہے۔ جادوگروں کا عقیدہ ہے کہ کسی شخص کے ناخن، سر کے بال اور پاؤں تلے کی مٹی اُس سے الگ ہونے کے باوجود اُس کی ذات کا لازمی جُز رہتی ہے چنانچہ جس شخص کو ایذا پہنچانا مقصود ہو اُس کے ناخنوں اور بالوں پر منتر پڑھتے ہیں۔ اِسی سبب قدامت پسند عورتیں اور مرد اپنے ناخنوں اور بالوں کو پھینکتے نہیں بلکہ محفوظ کر لیتے ہیں۔ کالی بلّی کو قدیم زمانے سے جادوگرنی سمجھتے رہے ہیں۔ یورپ میں جادوگرنیوں کی خُفیہ رسوم میں کالی بلّی کو ذبح کر کے اُس کا خُون پیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کالے مُرغے کا خون پیتے ہیں۔ جادوگرنیاں قبرستانوں میں مادرزاد برہنہ جاتی ہیں اور بچّوں کی نعشیں نکال کر کھاتی ہیں یا کسی نعش پر بیٹھ کر